

1

ف

عمیرہ احمد
(قسط نمبر ۱)



جانِ جہاں!

آج تمہیں گئے 423 دن ہو گئے۔ بلکہ لگتا ہے 423 سال ہو گئے۔ تم نے میری زندگی کے اُن دنوں کو جو تمہارے ساتھ لمحوں کی طرح گزرے تھے سال بنا دیا ہے۔ مجھے کئی بار لگتا ہے میں ریت کی گھڑی ہوں جو پچھلے 423 دنوں سے تمہاری واپسی کے دنوں کو منٹوں، گھنٹوں کی طرح گنتے ہوئے اُسی ریت کی طرح گرتی بھرتی جا رہی ہوں۔

تمہیں یاد ہے ہم پہلی بار جب ملے تھے، تو دوسری ملاقات میں یہ ساری باتیں تم نے کہی تھیں۔ وقت کے منٹوں، گھنٹوں کو گنتے کی، نہ گزرنے کی، لمحوں کی سست رفتاری کی، سالوں جیسا لگنے کی اور تب ہماری پہلی اور دوسری ملاقات میں بس ایک دن ہی تو آیا تھا۔

آج میں 423 پہاڑ سر کر کے بیٹھی ہوں۔ تم نے مجھے موم کا بنا دیا ہے۔ جل جل کر پکھلنے والا موم پر ختم نہ ہونے والا، راکھ نہ بن سکے والا اور تم جو سزا دے کے گئے ہو وہ بہت لمبی ہو گئی ہے۔ پر تمہاری دی ہوئی ہے اس لیے کاٹوں گی۔

آج چھت کی بیل میں پیلا پھول کھلا۔ تمہارے ہاتھ کی لگائی ہوئی بیل میں، کاسنی رنگ کا پیلا پھول۔ تین کلیاں اور بھی ہیں جو کل صبح میرے جاگنے تک کھل چکی ہوں گی۔ بہار آرہی ہے۔ ہر بار تم مجھے چھت کی اس بیل میں پیلا پھول کھلنے کی خبر دیا کرتے تھے۔ بہار بھی سب سے پہلے تم کو اپنے آنے کی خبر دیا کرتی تھی اور تم مجھے سفید گلاب لا کر دیا کرتے تھے۔ یہ سبز بہار اُن سفید گلابوں کے بغیر کبھی بہار نہیں لگتی تھی۔ مجھ سے تمہارا لگایا ہوا ہر پودا ہر پتھر تمہاری باتیں کرتا ہے، تمہارا پوچھتا ہے۔ پچھلے سال تمہیں پوچھتے پوچھتے وہ خزاں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس بار پھر تمہارا پوچھتے پوچھتے سرسبز ہو رہے ہیں۔ صرف ایک میں ہوں جس پر ایک ہی موسم ہے۔ پت جھڑکا اور ٹوٹنے بکھرنے کا۔

وہ سارے پرندے پھر سے آنے لگے ہیں جن کی بولیوں اور چہچہاہٹوں کے معنی تم مجھے بتایا کرتے تھے۔ وہ کب کیا مانگ رہے تھے، کیا کہہ رہے تھے، کیا چاہ رہے تھے، کون خوش تھا، کون اُداس۔ کون اپنے ساتھی کے ملن کی خوشی منا رہا تھا، کون اپنے ساتھی کی جدائی کا غم۔ کون گیت گارہا تھا اور کون نوحہ..... یہ سب صرف تمہیں پوچھنا آتا تھا مجھے نہیں اور مجھے لگتا تھا مجھے کبھی آ بھی نہیں سکتا پر جانِ جہاں تمہارے بغیر گزرے ان 423 دنوں میں یہ بولی بھی بوجھنے لگتی ہوں میں۔ اُن میں سے ہر ایک مجھ سے

صرف تمہارا پوچھتا ہے کہ وہ جو اس پہاڑ کے دامن میں، اس گھر کے پھولوں کے بیچوں بیچ چاندنی راتوں میں اور خنک سوپریوں میں اپنے سفید لباس میں ناچتا سماع کرتا تھا وہ کہاں ہے۔ جس کے پاؤں کی گردش کی بے اختیاری رومی کے مصرعوں کے وجد جیسی تھی۔ وہ اب کہاں ہے اور جس کے بازوؤں کی جنبش ہواؤں میں اپنا راستہ بناتی تھی وہ خود اس گھر کا راستہ کیوں بھول گیا ہے۔

میرے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں۔ اُن سے کیا بات کروں، کیا بتاؤں۔ اُن میں سے کوئی کچھ نہیں سمجھ پائے گا۔ نہ میری تاویلوں کو، نہ مجبوریوں کو نہ بہانوں کو اور نہ میرے غم کو۔ تم تو سمجھ سکتے تھے نا..... تم تو ساتھی تھے میرے۔ زندگی بھر کے ساتھ کا وعدہ کر کے لائے تھے مجھے۔ تم اس طرح چھوڑ کر کیسے چلے گئے۔

ان لفظوں کی سیاہی کو جو دھندلا رہا ہے وہ میری آنکھوں کا پانی ہے۔ آنسو نہیں ہیں۔ تمہارے بعد آنسو نہیں بہاتی میں۔ یہ پانی ہے، میرا بچپتاوا، میری ندامت۔ میری خطا کو مٹا دینے، بہا دینے کے لیے گرنے والا پانی۔ پروقت گزرتا جا رہا ہے۔ زندگی بیت رہی ہے۔ نہ میرا بچپتاوا کم ہو رہا ہے نہ تمہاری جدائی کا غم اور نہ تمہارا غصہ۔ زندگی میں ایک غلطی کی میں نے۔ تم نے مجھے وہ بھی معاف نہیں کی۔ رومی کا whirling درویش ہونے کے باوجود تم ساری دُنیا کے لیے رحم اور درگزر تھے۔ میرے لیے کیوں نہیں ہوئے۔ میں نہیں رہوں گی تب آؤ گے تو کیا فائدہ۔

اتنے خط، اتنی منتیں میں نے کب کسی کی کی ہیں، مگر تم سے کی ہیں تو مجھے اُس کا رنج نہیں۔ تمہارے ساتھ زیادتی بھی تو بہت بڑی کی تھی نا میں نے۔

یہ سارے خط جو میں نے تمہیں لکھے ہیں، یہ میرے بچپتاوے کے گواہ ہیں۔ صرف یہ کاغذ ہی ہیں جن پر میں اپنا دل کھول کر رکھ سکتی ہوں اور یہ میرا غم جھیل لیتے ہیں۔ جو میں کر بیٹھی ہوں وہ کس کو سنا سکتی ہوں میں، کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ میری اور تمہاری محبت کا قصہ سنے اور پھر جدائی کی داستان۔ محبت کی ہر کہانی کو لوگ من گھڑت کہتے ہیں یا پھر نادانی۔ بس اک میں ہوں جواب بھی اس پر یقین کیے بیٹھی ہوں۔

پتا نہیں یہ صحیح ہے یا غلط..... پتا نہیں نادانی ہے یا حماقت۔ پر جو بھی ہے یہ میری جان لے گئی۔

تمہاری خطا کار

جہاں

پانی کی پہلی بوند اُس کے سر پر گری تو اُس نے سائیکل چلاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں بادل اُس کی سائیکل کے پہیوں ہی کی رفتار سے رواں دواں تھے۔ سیاہ جنوں، بھوتوں جیسا رنگ اور شکلیں بنائے بادل۔ دوسری بوند ٹھیک اُس کی ناک کی نوک پر گری تھی اور وہاں سے اُس کے ہونٹوں اور ہونٹوں سے ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے اُس کی گردن کا سفر اُس نے سیکنڈز میں کیا تھا۔

اُس نے سر جھکا کر سپیڈ لڑکوپوری قوت سے گھمانا شروع کر دیا۔ یوں جیسے وہ اُن بادلوں اور اُن میں سمائی بوندوں کو ہرانا چاہتا ہو۔ ہر کولیس کی طرح..... تیز تیز..... اور تیز..... ہوا سے تیز..... بادلوں سے طاقتور۔

اُس کی سائیکل اس پگنڈی پر بچکولے کھاتی چلتی جا رہی تھی جو سبز کھیتوں کے پیچوں بچ گزرتی اب اُس وسیع علاقے پر پھیلے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو رہی تھی جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ بادل اور بارش اُس کا تعاقب کر رہے تھے یا کم از کم اُسے ایسا ہی لگ رہا تھا اور وسیع و عریض علاقے پر پھیلے ہوئے بلند درختوں کے اُس جنگل میں داخل ہوتے ہی اُسے لگا جیسے وہ بادلوں کو شکست دے آیا تھا۔

وہ اس جنگل کے سامنے سے روز گزر کر اسکول جایا کرتا تھا بلکہ اُس کے ساتھی اسکول کے سارے بچے روز ہی وہاں سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ جنگلی بیر ڈھونڈتے اندر گھس جاتے، مگر کبھی بھی بہت اندر تک جانے کی اُن کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی اور آج وہ اکیلا ہی اُس جنگل میں گھس آیا تھا۔ بلند و بالا گھنے درختوں نے سارے جنگل پر چھت تان رکھی تھی جس میں سے سورج کی روشنی اور ہوا چھن چھن کر آتی، لیکن اس وقت جب سورج بادلوں کی اوٹ میں تھا، تو جنگل دن میں بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ آٹھ نو سالہ بچہ جنگل میں آگے بہت آگے جانا چاہتا تھا، لیکن اُس تاریکی نے یک دم جیسے اُس کی ہمت پسپا کر دی۔ سائیکل روک کر اُس نے اپنا دل مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ جو تیز ہوا سے ہلتے پتوں اور ٹوٹنے والی شاخوں کی آوازیں سے دہل رہا تھا۔

اُس نے سائیکل سے اتر کر اُسے زمین پر لٹا دیا اور پیدل چلنے لگا۔ ہوا چند لمحوں کے لیے تھمی یوں جیسے جنگل نے اُس کے دل کا خوف بھانپ کر اُسے دلاسا دینے کے لیے سانس روک لیا ہو۔ وہ اب ایک عجیب سنائے میں کھڑا تھا۔ پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ اور پرندوں کا شور۔ وہاں اس وقت کوئی تیسری آواز نہیں تھی۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا اور اپنے جوتوں کے نیچے سوکھے پتوں کی چرمر ہونے کی آوازیں سنیں۔ وہ یک دم رُک گیا یوں جیسے یہ آوازیں بھی اُسے خوف زدہ کر رہی تھیں۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا جہاں اُس نے سائیکل زمین پر لٹائی تھی اور پھر درختوں سے پار نظر آنے والے کھیتوں کو..... یوں

جیسے وہ اپنے آپ کو یہ حوصلہ دینا چاہتا ہو کہ وہ جب چاہے وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ دوبارہ پلٹ کر وہ چند قدم اور آگے بڑھا۔ پھر اُسے یک دم ایک سوکھے درخت کا گرا ہوا تناظر آیا۔ وہ بے اختیار خوش ہو گیا۔ اپنی پشت پر لٹکا بیگ اُتار کر وہ تیزی سے اُس تنے تک گیا۔ جواتنا بڑا اور موٹا تھا کہ وہ اُس کے قد کے برابر آ رہا تھا۔ اپنے بیگ کو اُس نے تنے کی ایک زمین بوس شاخ پر رکھ کر اُس کی زپ کھولی اور اندر سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا لیٹر بکس نکالا جو لکڑی کے غیر ہموار ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ اُس نے لیٹر بکس تنے کے ساتھ زمین پر رکھ دیا۔ اس کے پاس کوئی کیل اور ہتھوڑی ہوتی تو شاید وہ لیٹر بکس کو تنے پر ٹھوک دیتا، لیکن ان چیزوں کی عدم موجودگی میں اُس نے اسے تنے کے ساتھ ٹکانا ہی کافی سمجھا۔ یک دم ہوا پھر چلنے لگی تھی۔ اُس نے تیزی سے بیگ میں سے ایک لفافہ نکالا اور اُسے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ لفافہ ڈالتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سا اطمینان ابھرا۔ ہوا زمین پر گرے خشک پتوں کو اڑانے لگی تھی اور وہ بچہ برق رفتاری سے اپنے بیگ کی زپ بند کر کے اُسے اپنی پشت پر چڑھاتے ہوئے اُس طرف بھاگا جہاں اُس کی سائیکل پڑی تھی اور تبھی اُس نے اپنے سر پر بارش کی تیسری بوند گرتی محسوس کی۔

ایک، دو، تین..... بوندوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ پورا جنگل اُس کی لپیٹ میں تھا۔ وہ بچہ کسی warrior کی طرح بیگ پشت پر چڑھائے بھاگتا زمین پر گری چھوٹی موٹی شاخوں کو پھلانگتا اور اوپر سے گرنے والے لکڑی کے ٹکڑوں سے بچتا اپنی سائیکل کی طرف بھاگ رہا تھا، مگر اس بار بارش اور بادل اُسے شکست دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

وہ سائیکل پر سوار ہوا، تو بھیگ چکا تھا۔ سائیکل دوڑاتے وہ جب جنگل سے نکلا، تو طوفانی بارش کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کھیتوں کے درمیان اُس پگڈنڈی پر گاؤں کے بہت سے بچے سائیکلوں پر اور پیدل بارش میں بھیگتے اٹھیلیاں کرتے بھاگ رہے تھے اور وہ آٹھ سالہ بچہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا اور وہ بے پناہ خوش تھا۔ بری طرح دھڑکتے دل اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ..... اُس نے اُس دن اپنی ماں کے لیے بہت بڑا کام کیا تھا اور اپنی خوشی پر قابو پانا اُس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ بہت تیزی سے سائیکل چلاتا، بارش میں بھیگتا، شور مچاتا اور سر پر اڑتے سیاہ بادلوں کے ساتھ ریس لگاتا ہر کوئیس ساری رُکاؤ میں عبور کر کے سونے کا وہ سکہ جیت چکا تھا جو سب سے بہادر کے لیے تھا۔

اُس کینوس پر آیت ایک عجیب روشنی میں گھری ہوئی تھی۔ لفظ جیسے نور تھے حرف جیسے موتی اور اعراب اُن پر بادلوں کی طرح سایہ فگن
اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ .

وہ بوڑھا ہاتھ کینوس پر ان آیت کی خطاطی میں مصروف تھا۔ وہی روشنی جو اس آیت کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھی۔ وہ اُس ہاتھ کو بھی گھیرے ہوئے تھی پر ہاتھ رُک نہیں رہا تھا۔ جھریوں زدہ جلد پر نظر آنے والی نیلی رگیں اُس روشنی میں کسی ایکسرے میں دکھائی دینے والی چیزوں کی طرح عیاں تھیں اور ہاتھ رُکے بغیر چلتا ہی جا رہا تھا کسی ماہر کی طرح جسے اپنے کام میں مہارت ہو۔

فضا میں اب کوئی اپنی بے حد خوبصورت آواز میں وہ آیت تلاوت کرنے لگا تھا۔ بے حد دلکش بھاری صاف، مگر میٹھی مردانہ آواز جو کان کے پردے سے سیدھی دل کے تاروں کو برِبط کے تاروں کی طرح ہلائے۔ وہ آواز صرف آیت کا وہ حصہ نہیں پڑھ رہی تھی جو کینوس پر تھی بلکہ پوری آیت پڑھ رہی تھی۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل (ایسی صاف شفاف ہے کہ) گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارہ ہے۔ اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے۔ (یعنی) زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ آگ اُسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے۔ (بڑی) روشنی ہی روشنی (ہو رہی ہے) اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے اور اللہ جو مثالیں بیان فرماتا ہے تو لوگوں کے (سمجھانے کے لیے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

(سورۃ النور 35)

تلاوت کرنے والی وہ آواز اب یک دم خاموش ہو گئی تھی۔ فضا میں اب بھی اُس آیت کی گونج تھی وہ ہاتھ اب بھی کینوس پر اُسی آیت کو بنا سنوار رہا تھا۔

اور پھر یک دم بہت دور سے ہلکی موسیقی کی آواز آنے لگی۔ نور کا وہ ہالہ جو اُس ہاتھ اور کینوس کو فوکس کیے ہوئے تھا یک دم دور جانے لگا اوپر آسمان میں اور نیچے اب اُس کینوس کے سامنے ایک کھلے میدان میں جو ویسی ہی دودھیا روشنی سے بنایا ہوا تھا۔ ایک شخص whirling Darvesh کا لباس پہنے بازو پھیلائے گول چکر کاٹ رہا تھا۔ بے حد آہستہ یوں جیسے اُسے کسی پیر کی طرح کسی نے ہوا کے دوش پر رکھ دیا ہوا اور پھر وہ موسیقی بلند ہونا شروع ہوئی اور اُس شخص کا وجود تیزی سے گھومنا شروع ہوا تھا۔ اُس کا سفید لباس اب ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور اس کے سر پر موجود اونچی ٹوپی اُس کا چہرہ جیسے کچھ ڈھکے

ہوئے تھی اور اس کی رفتار اب تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ فضا میں گونجنے والی اُس بلند اور مسحور کن بانسری کی آواز کے ساتھ جواب ہر چیز پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کینوس اب اتنا چھوٹا ہو چکا تھا کہ اوپر سے نظر ہی نہیں آتا تھا اور وہ ہاتھ بھی اب غائب تھا۔ نیچے اُس میدان میں روشنی کے اس ہالے میں اب صرف اُس whirling Darvesh کا رقص کرتا وجود تھا جس کا رقص تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا تیز کہ اُس کا سفید لباس اور اس کے سر پر موجود ڈوپی اب ایک پھول اور اس کے مرکز کی طرح لگنے لگے تھے اور پھر اس رقص میں اور تیزی آگئی۔ اتنی تیزی کہ انسانی آنکھ کا اس پر نظر جمانا اور اُسے شناخت کرنا مشکل ہونے لگا اور پھر یک دم اُس وجود میں آگ لگی اور وہ شعلے کی طرح بھڑکا۔ پھر پلک جھپکتے ہی جل کر خاک ہو گیا اور اُس کے ساتھ ہی جیسے وہ اُس ساری روشنی کو لے کر اندھیرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔



نوسال کا وہ بچہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا سانس تیز چل رہا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی خوف ناک خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہو۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور اُس کے بستر میں اُس کی ماں اس کی طرف پشت کیے سو رہی تھی۔ اپنے جسم سے چادر ہٹا کر اُس نے بلی کی طرح بڑی احتیاط سے پاؤں زمین پر اتارے اور دبے قدموں چلتا ہوا وہ سیدھا کمرے کے اس کونے میں گیا جہاں سٹڈی ٹیبل پر ایک لیپ رکھا تھا جسے اگر وہ آن کرتا، تو اس کی ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ اس نے پلٹ کر بستر پر لیٹی ماں کو دیکھا۔ اُس کی پشت سٹڈی ٹیبل کی طرف تھی۔ وہ جیسے یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ روشنی ماں تک جائے گی یا نہیں۔ اور اس نے اندازہ لگا لیا۔ ٹیبل لیپ پر وہ اسکارف ڈالا تھا جو اس کی ماں نے سٹڈی ٹیبل کی کرسی کی پشت پر ڈال رکھا تھا۔ بے حد احتیاط کے ساتھ اُس نے لیپ کا بٹن دبایا کہ اُس کی آواز بھی ماں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ لیپ روشن ہوا تو اُس نے پلٹ کر ماں کو دیکھا۔ روشنی ماں تک نہیں گئی تھی۔ اس کا ”ٹوٹکا“ کام کر گیا تھا۔ اس کی ماں کے وجود میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ وہ فاتحانہ اور مطمئن انداز میں مسکرایا پھر کرسی پر بیٹھ گیا جس پر اب اسکارف سے جھلکتی روشنی میز کی سطح پر پڑ رہی تھی۔ سٹڈی ٹیبل کے ایک کونے میں سچی اپنی کتابوں اور نوٹ بکس میں سے ایک نوٹ بک اس نے کھولی۔ میز پر رکھے پین ہولڈر میں رکھے رنگین مارکرز میں سے ڈارک بلورنگ کا مارکر اُٹھالیا۔

”تم کیا کر رہے ہو؟“ اندھیرے کمرے میں اس کی ماں کی آواز گونجتے ہی بچے نے برق رفتاری سے لیپ کا بٹن آف کیا اور جیسے اپنا سانس بھی روک لیا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم سٹڈی ٹیبل کے سامنے بیٹھے ہو۔ کیا کر رہے ہو؟“ اس کی ماں نے دوبارہ

”ہوم ورک..... تھوڑا سا رہ گیا تھا..... بس دو page-“ اس بچے نے بے اختیار کہا اور لیمپ دوبارہ آن کر دیا۔ چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا پتا نہیں اس کی ماں اندھیرے میں بھی کیسے دیکھ لیتی تھی۔

”ٹھیک ہے جلدی سے کرو اور آکر سو جاؤ۔“

”اوکے۔“ وہ بے اختیار خوش ہوا اور اس نے ایک نظر پلٹ کر ماں کو دیکھنے کے بعد جیسے سکون کا سانس لیتے ہوئے دوبارہ اس کا غذ پر تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔

اُس نے خط کے نیچے، اپنا نام لکھا جلدی سے خط والے کا غذ کو احتیاط سے جھاڑا، تہ کیا اور دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر اُس میں ڈال دیا۔ لفافے کے باہر اُس نے ایک بار پھر ایڈریس والی لائنز کو ایڈریس کے ساتھ fill کیا اور پھر لفافے کے اُس Flap کو زبان پر پھیرتے ہوئے گھیرا لیا جو چپک کر بند ہونا تھا۔

لفافے کو چپکا کر بند کرتے ہی اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اس کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا تو اب بھی کروٹ کے بل اس کی طرف پشت کیے ہوئے لیٹی ہوئی تھی۔



اپنے کاٹیج کے برآمدے میں کھڑے اُس نے گاؤں کے ڈاکیا کو بہت دور سے اس کی سائیکل پر سوار گھروں کی اس لین میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا جس کے تقریباً آخر میں اس کا گھر بھی تھا۔ اس کا دل یک دم کسی تتلی کی طرح پھڑپھڑایا تھا۔

ڈاکیا گھروں کے باہر لگے لیٹر باکسز میں ان کی ڈاک رک رک کر ڈالتا اُس کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔

یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ اُسے ڈاک کے آنے کے اوقات کا پتا تھا اور وہ اسکول سے آنے کے بعد اپنے کاٹیج کے برآمدے میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ روز ڈاک آیا آتا اور اُس کے گھر کے سامنے سے گزر جاتا..... اور اس کا دل تتلی کی طرح پھڑپھڑانا شروع کرتا اور پھر snail کی رفتار پر آ جاتا، مگر جس عمر میں وہ تھا اس عمر میں خواب اور انتظار دونوں آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔

اور آج بالآخر اُس کے تتلی کی طرح پھڑپھڑاتے دل کو کسی snail کی رفتار پر نہیں جانا پڑا تھا۔

ڈاکیا اس کے گھر کے باہر لگے ہوئے لیٹر باکس کی طرف آنے لگا، تو اس نے برآمدے سے نیچے دوڑ

”کیا ہمارا خط آیا ہے؟“ اس نے ڈاکیے کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔ ڈاکیا مسکرایا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافوں میں سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور اس بچے کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس لفافے پر نظر ڈالتا۔ پیچھے سے اس کی ماں نے آکر اس سے وہ خط لیتے ہوئے کہا۔

”میں کب سے کھانے کے لیے آوازیں دے رہی ہوں اور تم یہاں کھڑے ہو۔“

”ممی یہ میرا خط ہے۔“ اس نے احتجاج کرتے ہوئے ماں سے لفافہ لینا چاہا۔ اس کی ماں نے حیرانی سے کہا۔

”تمہارا کہاں سے آئے گا؟ یہ تو میرا ہے۔ دیکھو پاکستان سے آیا ہے۔“ اس کی ماں نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر اس پر لگی ٹکٹیں اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ اُس کا دل ڈوبا۔ سانس رُکا پھر اس نے سر جھکا لیا۔

”تم کو ٹکٹیں چاہئیں نا اس کی۔“ وہ اندر جا رہا تھا جب اس نے اپنے عقب میں ماں کی آواز سنی۔ وہ ٹکٹیں جمع کیا کرتا تھا اور گھر میں آنے والے ہر خط پر لگی ہوئی ڈاک کی ٹکٹ پر اُس کا استحقاق ہوتا تھا مگر اس وقت اُسے اس لفافے اور اس ٹکٹ میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

آج 30 ویں خط کا بھی جواب نہیں آیا تھا۔



وہ سائیکل پراسکول سے گھر آتے ہوئے اُسی پگڈنڈی میں اُسی جنگل کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی گردن موڑ کر اُس طرف نہیں دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی خفگی تھی جو وہ دل میں پالے ہوئے تھا۔

”ایسا بھی کیا کہ اتنے خط لکھو اور کوئی جواب نہیں۔“

اُس نے تیزی سے سائیکل چلا کر اُس جنگل کے سامنے سے گزرتے ہوئے سوچا۔

”سب کے خطوں کے جواب ملتے ہیں اور میرا..... جبکہ میرا خط سب سے خوب صورت تھا۔ میں نے اُس پر پھول اور ستارے بھی بنائے تھے وہ بھی رنگین مارکرز سے۔ اور ہر جملے کے بعد فل سٹاپ بھی لگایا تھا..... اور کاغذ بھی صاف ستھرا..... مارکر بھی اچھا تھا..... کہیں ink کے دھبے بھی نہیں لگے تھے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے خط کی خوبیاں اور خصوصیات گن رہا تھا جو ہر لحاظ سے اُسے ایک جوابی خط کا اہل کر رہے تھے، مگر جوابی خط.....

وہ اب کئی دنوں سے صبح اسکول جاتے اور واپس آتے اس جنگل کے سامنے سے گزرتے بے حد خفگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر گزر جاتا۔ یہ اُس کی ناراضگی کا اظہار تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک خط نہ ملنے پر یہی کر سکتا تھا۔

اُس نے اب ڈاکیے کے انتظار میں گھر کے برآمدے میں کھڑے رہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کبھی اُس کے گھر نہیں آتا تھا۔ آتا بھی تو صرف اس کی ماں کی ڈاک لاتا۔

سائیکل گھر کے باہر ہی کھڑی کر کے وہ بڑی اُداسی کے عالم میں دروازے کو دھکیلتا گھر میں داخل ہوا تھا۔ یقیناً اس کی ماں بیرونی احاطے میں تھی اسی لیے وہ دروازہ کھول گئی تھی۔ ورنہ وہاں دروازہ بجانے کی آواز آتی نہ گھنٹی کی۔

اپنے کمرے میں آکر اُس نے اسکول بیگ رکھا اور پھر بستر پر رکھے اپنے کپڑے دیکھے۔ وہ بھی اُس کی ماں ہی نے رکھے تھے۔ کچھ خفا سے انداز میں اُس نے اپنا یونیفارم تبدیل کرنا شروع کیا تھا جو وہ تبدیل کرنے کے موڈ میں نہیں تھا، لیکن وہ ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیرونی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر بھی اُس نے اپنی قمیص کو اتارنے کی دھینگا مشتی میں نوٹس نہیں کی تھی مگر ابھی وہ یونیفارم کی شرٹ اتار کر سیدھا ہی ہوا تھا جب اُس نے باہر سے اپنی ماں کی آواز سنی۔

”تمہارا خط آیا ہے۔“ یونیفارم کی شرٹ ہاتھ میں پکڑے اس کا دل ایک بار پھر تتلی کی طرح

پھڑپھڑایا۔

”کس کا۔“ اس نے وہیں کھڑے بے یقینی سے چلا کر پوچھا۔

”تمہارا۔“ اس کی ماں نے جیسے اس کی بے یقینی ختم کی۔

”کس نے بھیجا ہے؟“ اس نے اپنے بے قابو ہوتے ہوئے دل کے ساتھ ایک بار پھر پوچھا۔

”اللہ تعالیٰ نے۔“ وہ سانس لینا بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے گول ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اُس glass penthouse کی سب سے خاص چیز سٹنگ ایریا میں لگی ہوئی بہت بڑے سائز کی وہ کیلی گرائی تھی جس پر اهدنا الصراۃ المستقیم لکھا ہوا تھا۔ Aqua blue کے شیڈز میں اور خطاطی کے محقق اسٹائل میں۔ اُس کیلی گرائی کے علاوہ سٹنگ ایریا میں اگر کوئی اور paintings تھیں تو وہ تجریدی nude تھیں۔ سٹنگ ایریا میں جگہ جگہ چھوٹے بڑے سنگی مجسمے بھی تھے اور وہ بھی تقریباً تمام یونانی دیو مالائی دیویاں تھیں۔ وہ بے لباس تھیں یا پھر نہ ہونے کے برابر لباس میں بنائی گئی تھیں۔

وہ glass penthouse جیسے قبل اسلام کے کعبہ جیسا منظر پیش کر رہا تھا جہاں اهدنا الصراط مستقیم کی اُس کیلی گرائی کے نیچے اور ارد گرد ہر طرف بُت ہی بُت تھے۔ پہلی نظر میں کوئی بھی اُس پینٹ ہاؤس کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ انٹریئر کرنے والے کے عمدہ aesthetics اور اچھے taste کا عکاس تھا اور پہلی بار وہاں آنے والے کو کچھ دیر کے لیے مسحور کر دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔

سٹنگ ایریا کے باہر اوپن ٹیرس اور روف گارڈن تھا اور اُس سے پرے بہت پرے پس منظر میں سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا پانی اور اُس میں چلتی پھرتی کشتیاں۔ سٹنگ ایریا کو ٹیرس سے الگ کرنے والی دیوار شیشے کی تھی جس میں چند ایک لکڑی کے پینل تھے اور جو بھی سٹنگ ایریا میں کھڑا ہوتا وہ ٹیرس اور وہاں سے دور سمندر کی لکیر بنا کسی دقت کے دیکھ سکتا۔

اُس پینٹ ہاؤس کے سٹنگ ایریا میں اُس کیلی گرائی، مجسموں اور paintings کے علاوہ دوسری نمایاں چیز اُس کی ایک وال کے ساتھ رکھے ایک شیلف میں ایوارڈ، ٹرافیوز اور شیلڈز کا ایک انبار تھا اور اُس ہی شیلف کے اوپر دیوار پر لگے ہوئے بہت سے فوٹو فریمز جن میں ایک مرد بہت سے فنکشنز اور ایونٹس میں بہت سے نامور اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ نظر آ رہا تھا اور کچھ فریمز میں وہ مختلف میگزینز کے سرورق پر مختلف ہیڈنگز کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ ایوارڈز اور اُن فوٹو فریمز کی وہ دیوار اُس کیلی گرائی کی دیوار کے بالکل سامنے تھی اور دونوں دیواروں کے درمیان موجود سٹنگ ایریا میں بیٹھنے کے لیے مختلف شکلوں اور قسموں کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔

وہ گلاس پینٹ ہاؤس قلبِ مومن کی وہ جُت تھی جس کے عشق میں وہ مبتلا رہتا تھا اور وہاں ہونے والی پارٹیز میں شریک ہونے والے اُس کے دوست بھی۔ وہ انڈسٹری کا نامور فلم ڈائریکٹر تھا جو ایک ایڈ ایجنسی بھی چلاتا تھا اور کمرشل فلمز کرنے سے پہلے وہ پاکستان کی چند بڑی ایڈ ایجنسیز کے ساتھ آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کر چکا تھا اور اس وقت وہ پاکستان کے چند بہترین نوجوان آرٹ اور کمرشل

فلم ڈائریکٹرز میں سے ایک مانا جاتا تھا اور اُس شیف پر موجود شیلڈز، ایوارڈز اور ٹرائفیر کی تعداد جیسے اُس کے اس status کو مزید reinforce کرنے کے لیے کافی تھیں۔

رُشنا قدوائی اُس وقت اپنے TV شو کے لیے قلب مومن کا ایک انٹرویو کے لیے اُس کے اس پینٹ ہاؤس پر اپنے crew کے ساتھ موجود تھی اور اُس جگہ کو دیکھ کر ویسے ہی awestruck ہوئی تھی جیسے وہاں پہلی بار آنے والا کوئی بھی visitor ہو جاتا۔ اُس نے قلب مومن کے بارے میں جتنا سُن رکھا تھا اتنی ہی شہرت اُس نے اس پینٹ ہاؤس کی نائٹ پارٹیز کی بھی سُن رکھی تھی اور آج وہ بالآخر مہینوں کے بعد قلب مومن سے انٹرویو کی اپائنٹمنٹ لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اُس کا crew اس وقت سٹنگ ایریا کے ایک حصے کو اُس انٹرویو کے لیے منتخب کر کے وہاں lighting وغیرہ کرنے اور کیمرا adjust کرنے میں مصروف تھا اور رُشنا قدوائی قلب مومن کے اسٹنٹ کے ساتھ گپ شپ کرنے میں جس نے اُنہیں یہاں ریسو کیا تھا اور جو اس انٹرویو کے لئے قلب مومن سے coordination کر رکھا تھا۔

”اگلی فلم کے لیے آڈیشن کب سے اسٹارٹ کر رہے ہو تم لوگ؟“ رُشنا قدوائی نے مومن کے اسٹنٹ داؤد سے پوچھا تھا۔ وہ روٹین کی chitchat تھی۔

”اگلے ہفتے سے شروع کر رہے ہیں۔“ داؤد نے جواباً گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ مومن عام طور پر ہمیشہ وقت پر آتا تھا۔ آج وہ غیر معمولی طور پر دس منٹ لیٹ تھا۔

”اچھا تو ساری ہی کاسٹ نئی اُٹھاؤ گے تم لوگ؟“ رُشنا نے مزید گریدا۔

”ہاں وہ تو ظاہر ہے مومن نے اپنی تینوں فلمز میں ابھی تک مین کاسٹ میں کسی کو repeat نہیں کیا۔“ داؤد نے کھڑے کھڑے اپنے موبائل پر مومن کو ٹیکسٹ کرتے ہوئے کہا اور پھر ساتھ ہی ایکساٹینڈ انداز میں رُشنا سے کہا۔

"He is here." داؤد نے پلٹ کر کسی کو سلام کیا اور رُشنا قدوائی نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا

تھا۔ اُس پینٹ ہاؤس کا مالک جتنا پکچر پرفیکٹ ہونا چاہیے تھا قلب مومن ویسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ دھاری دار سفید اور بوسلم فٹ آدھے بازوؤں والی کاٹن شرٹ اور Dockers کی Khaki جینز میں ویسے والی ہی اسٹائلش Tom Ford کے جوتے پہنے ہوئے تھا اور بے حد انفارمل لباس میں ہونے کے باوجود ایک بے حد فارمل لُک لیے ہوئے تھا۔ رُشنا قدوائی کے لیے قلب مومن کا چہرہ اُس سے نہ ملنے کے باوجود اجنبی نہیں تھا۔ وہ درجنوں پارٹیز اور ایوارڈ شوز میں اُسے دیکھ چکی تھی، مگر اُس کے گھر پر وہ پہلی بار

اُسے دیکھ رہی تھی اور پہلی بار اُس سے ڈائریکٹ آمناسا منا ہوا تھا۔ قلبِ مومن charismatic تھا۔ یہ اُس نے کئی لوگوں سے سنا تھا، مگر وہاں اُس کے آمنے سامنے کھڑے اُس سے ملتے ہوئے پہلی بار اُس نے اُس کی ”مقناطیسیت“ محسوس بھی کی تھی۔

”میں لیٹ تو نہیں ہوا۔“ اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے خوش گوار لہجے میں رُشنا سے پوچھا تھا۔

”بہت زیادہ نہیں۔“ وہ جواباً ہنسی۔ وہ اُسے خوس کر رہا تھا اور اپنے جرنلٹک کیرئیر میں یہ رُشنا کے ساتھ ساتھ کم کم ہی ہوا تھا۔

”lighting ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ رُشنا کو وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھا اور اب اُس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں انٹرویو کے لیے lights اور کیمرے لگائے گئے تھے۔ وہ رُشنا کے کسی رد عمل کا انتظار کیے بغیر DOP کے مانیٹر پر فریم دیکھنے لگا اور اس سے پہلے کہ رُشنا یا اُس کی ٹیم میں سے کوئی بھی کچھ اور کہتا وہ لائٹ مین کو ہدایات دینے لگا۔ 5-7 منٹ بعد اُس نے مومن کو دوبارہ مانیٹر پر جھکتے دیکھا اور پھر ایک لمحہ بعد ہی وہ سیدھا ہو گیا اور اُس نے رُشنا کو مخاطب کیا۔

”اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ مسٹر پرفیکشنٹ تھا۔ یہ اُس نے کئی لوگوں سے سنا تھا جو اُس کے ساتھ اُس کے ads اور فلمز میں کام کر چکے تھے لیکن اُس کا عملی مظاہرہ اُس نے قلبِ مومن سے اپنی پہلی ملاقات میں ہی دیکھ لیا تھا۔ رُشنا کچھ ندامت والے انداز میں مانیٹر کی طرف گئی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسی کیفیت کا شکار ہوتا کیوں کہ وہ یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ جس سے وہ انٹرویو لینے جائے گی وہ اُسی کے crew کا کوئی نقص پکڑ کر اُس کے سامنے رکھ دے گا۔ مانیٹر پر فریم پر پہلی نظر ڈالتے ہی رُشنا مومن کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ وہ والا فریم ہی نہیں لگ رہا تھا جو وہ چند لمحے پہلے اپنے اس مانیٹر پر دیکھ کر ہٹی تھی۔ کیمرے کے اینگل اور لینز کی معمولی ایڈجسٹمنٹ اور ایک دو لائٹس کی دوبارہ سے placement نے اُس فریم کو بالکل بدل دیا تھا۔ مومن اپنے کام کا ماہر تھا اُسے یہ بات ماننے میں اُس لمحہ کوئی عار نہیں ہوا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر اُس سے بات کرنا چاہتی تھی اور اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر پلٹنے پر اُس نے اُسے وہاں سے بہت دیر داؤد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے پایا یوں جیسے اُسے پتا تھا کہ اُس کے فریم میں کوئی خامی ہوگی ہی نہیں اور اُسے اُس کے تعریفی ریمارکس کی بھی ضرورت نہ ہو۔ وہ قابل رشک حد تک پراعتماد تھا۔ رُشنا کو ہاتھ میں پکڑے انٹرویو کے لیے تیار کیے گئے سوال نامہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی وہ اُس میں سے بھی کسی سوال پر کوئی اعتراض کرتا۔

”قلب مومن فلم انڈسٹری میں آپ کا کیرئیر..... He came, he saw, he

conjured کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا آپ کے لیے سب کچھ اتنا ہی آسان رہا ہے؟“ وہ باآخر انٹرویو کے لیے بیٹھ گئے تھے اور ابتدائی chit chat کے بعد رُشنا قدوائی نے اُس سے پہلا اہم سوال کیا تھا۔ سوال کرتے ہوئے اُس سے نظر ملنے پر رُشنا قدوائی کو احساس ہوا کہ قلب مومن کی آنکھیں بے حد تیز اور چمکدار تھیں اور اُس سے نظر ملا کر بات کرتے رہنا کسی کے لیے بھی مشکل ہو سکتا تھا۔ قلب مومن کو وہ اگر ایک لفظ میں دوبارہ کہیں بیٹھ کر بیان کرتی تو وہ لفظ ”اعتماد“ ہوتا۔ اُس نے انڈسٹری کے بہت کم لوگوں میں اتنا اعتماد دیکھا کہ وہ دوسرے کو کنفیوز کرنا شروع کر دیتا تھا۔

ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھے اُس نے رُشنا کا سوال سنا مسکرایا اور پھر کہا۔

”اس سے بھی زیادہ آسان رہا ہے میرا سفر..... میں مانتا ہوں میں خوش قسمت رہا ہوں۔ نہ اس فیلڈ میں آنے کے لیے مجھے کسی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔“ اُس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ رُشنا نے اُس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور اُس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ flirt تھا مگر اب تک مومن کے ساتھ بات چیت میں اُسے مومن کے کسی انداز میں اُس کے flirt ہونے کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ وہ اُس سے بے حد gentlemanly طریقے سے مخاطب ہو رہا تھا۔ اُس کے جواب کے دوران رُشنا قدوائی کا ذہن کہیں اور مصروف تھا۔ اُس کے خاموش ہونے پر بھی وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی تھی یوں جیسے اُس کے مزید کچھ کہنے کی منتظر ہو، لیکن پھر اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بات ختم کر چکا تھا اور اُس کے اگلے سوال کا منتظر تھا۔

”آپ کی فیملی میں سے کوئی اور بھی اس فیلڈ میں ہے؟“ رُشنا کو اگلا سوال ویسے ہی یاد تھا۔ ”کوئی نہیں۔“ کھٹاک سے جواب آیا تھا اور اس سوال کے ساتھ ہی رُشنا قدوائی کے لیے انٹرویو کے سب سے دل چسپ حصے کا آغاز ہو گیا تھا۔

”اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں کہاں پیدائش ہوئی؟ کون کون ہے آپ کی فیملی میں۔“ رُشنا نے جتنی دل چسپی سے یہ سوال پوچھا تھا۔ جواب کا آغاز اتنی ہی غیر دل چسپی سے دیا گیا تھا۔ ”میری پیدائش ترکی میں ہوئی۔ فادر کا تعلق ترکی سے تھا اور مدر کا پاکستان سے۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہیں اور دونوں کی ڈیٹھ ہو چکی ہے۔“ رُشنا اُس کے جواب پر بے اختیار چوکی۔

”اوہ اسی لیے آپ کے features اتنے دیسی نہیں ہیں۔ میڈیا میں بھی زیادہ لوگوں کو یہ پتا

نہیں ہوگا کہ آپ کے پیرٹس کا تعلق ترکی سے ہے۔ کتنا عرصہ رہے آپ ترکی میں؟“

”بچپن تقریباً سارا ہی وہاں گزرا، نو جوانی کا کچھ حصہ..... اُس کے بعد میں امریکہ چلا گیا تھا۔

ہائی اسکول کے بعد..... تقریباً چھ سات سال وہاں رہا اور سات آٹھ سال سے اب پاکستان میں ہوں۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

رُشنا کو اُس کی سنجیدگی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”پیرٹس میں سے کوئی اور میڈیا یا فائن آرٹس سے منسلک رہا؟“ وہ اس بار چند لمحوں کے لیے

اُس کے سوال پر خاموش رہا اور پھر اُس نے کہا۔

”میرے فادر ایک calligrapher تھے۔“

”very interesting“ رُشنا کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”مگر میں بہت چھوٹا تھا جب اُن کی ڈیٹھ ہو گئی۔“

”اور آپ کی مدر؟“ رُشنا نے بے ساختہ پوچھا۔ مومن بے ساختہ چونکا پھر اُس نے اسی روانی

سے کہا۔

”وہ ہاؤس وائف تھیں۔“

”مجھے بڑا انٹرسٹنگ لگ رہا ہے کہ آپ کے فادر Turkish تھے اور مدر پاکستانی اور اُن کی

شادی ہوئی۔ کیا یہ لو میرج تھی؟“ رُشنا پوچھے بغیر نہیں رہ سکی اور اُس نے پہلی بار مومن کے ماتھے پر چند بل دیکھے پھر اُس سے کہتے سنا۔

”انٹرویو میرا ہے نا؟“

”جی جی آپ ہی کا ہے۔“ رُشنا گڑبڑائی۔

”تو میرے بارے میں ہی بات کیجیے۔“ مومن نے اگلا جملہ کہا۔ رُشنا نے اُس کی صاف گوئی

کے بارے میں بھی سنا تھا، مگر اُس کا اتنا بروقت اظہار وہ توقع نہیں کر رہی تھی۔

”calligraphy سے کمرشل فلم میکنگ تک transition یا سفر آپ اسے جو بھی کہیں، یہ کچھ

عجیب ہے؟“ وہ مومن سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔ مومن کے ماتھے پر وہ بل دوبارہ آئے تھے۔

”کیلی گرافی سے میرا کوئی تعلق نہیں وہ میرے فادر کرتے تھے۔ میں امریکہ سے فلم میکنگ ہی

پڑھ کر آیا ہوں اور شروع سے فلم میکنگ ہی کر رہا ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ پہلے وہ ایڈ فلمز تھیں اب

کمرشل۔“ اُس نے تفصیل سے بتایا۔

”میں نے یہ سوال اس لیے پوچھا کہ اگر آپ کے father کیلی گرافی کرتے تھے، تو یقیناً مذہبی اثر ہوگا آپ کی فیملی میں اور.....“ اُس نے پہلی بار رُشنا کو انٹرویو کے دوران ہی ٹوک دیا تھا۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ انٹرویو میرے بارے میں ہے، تو آپ سوالوں کا فوکس مجھ پر ہی رکھیں۔ میرے پرنٹس کیا کرتے تھے اور کیا نہیں انٹرویو اُس کے بارے میں نہیں ہے۔“ رُشنا کو سمجھ نہیں آئی وہ کس بات کی وجہ سے irritate ہوا تھا۔ اُس نے اُس کے ماں باپ کے حوالے سے کوئی قابل اعتراض سوال نہیں کیا تھا، مگر وہ اس وقت قلبِ مومن سے argument نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کے پاس وقت محدود تھا اور سوال لامحدود.....

”آپ کی فلمز میں گلیمر کی بھرمار ہوتی ہے۔ عورت کو ایک object کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر critics کا کہنا ہے کہ اگرچہ آپ کی فلم visually ایک ماسٹر پیس کی طرح ہوتی ہے اور جتنی خوب صورتی سے آپ اپنی ہیروئن کو فلم اسکرین پر ایک Diva کے طور پر expose کرتے ہیں انڈسٹری کا کوئی اور ڈائریکٹر نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی ہیروئن کو object of fantasy بنادیتے ہیں۔“ اس نے رُشنا کو دوبارہ ٹوکا اور کہا۔

”آپ کا سوال کیا ہے..... وہ پوچھیں critics کیا کہتے ہیں وہ میں جانتا ہوں۔“ رُشنا بلبش ہوئی اُسے اندازہ نہیں تھا وہ اُسے اس طرح ٹوکے گا۔

”میرا سوال یہ ہے کہ آپ کی فلمز critics کی نظر میں cheap entertainment کے سوا کچھ نہیں وہ آپ کی نظر میں کیا ہیں؟“ رُشنا نہ چاہتے ہوئے بھی اس بار rudس ہوئی تھی۔

”اور یہ critics وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی hit films پر اپنے flop reviews لکھ لکھ کر پانچ منٹ کے لیے famous ہونا چاہتے ہیں۔“ اس کا ویسے ہی لوہا توڑ جواب آیا تھا۔

”میری نظر میں میری فلمز میرے لیے object of fantasy ہیں۔ میں وہ بناتا ہوں جو مجھے entertain کرتا ہے اور وہ اچھی ہیں یا بُری اُس کا فیصلہ باکس آفس کرتا ہے۔ critics کے ٹو اور تھری سٹار reviews نہیں۔“ اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ جو بھی کہیں یہ بات تو ایک fact ہے آپ اپنی فلمز میں عورت کو ایک object کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک باریبی ڈول سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ گلیمر..... گلیمر..... گلیمر۔“ رُشنا نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ قلبِ مومن کی صاف گوئی نے یک دم جیسے اُسے بھی بے حد صاف گو بنادیا تھا۔

”یہ قلب مومن نہیں کرتا۔ یہ پوری دُنیا کی فلم انڈسٹری کرتی ہے۔ 80 فی صد فلمز عورت ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ اُس کے جسم اُس کی خوب صورتی اُس کے گلیمر کے گرد۔ میں وہ آرٹ فلمز بنانا نہیں چاہتا جس کو دیکھنے کے لیے critics بھی سینما نہیں جائے اور صرف trailer دیکھ دیکھ کر world classic قرار دیتے ہیں۔“

”آپ بہت blunt ہیں۔“ رشنا کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”یہ خامی ہے کیا؟“ اُس نے فوراً پوچھا۔

”نہیں..... میں جانتی ہوں یہ آپ کی کامیابی کی عنایت ہے۔ کامیابی میں ہر شخص blunt ہوتا ہے۔“ رشنا نے کہا۔ وہ اس بار مسکرایا اور اُس نے کہا۔

”میں ناکامی میں اس سے زیادہ blunt ہوں گا۔ Don't worry۔“ رشنا بھی مسکرا دی

تھی۔

”اب اگر کامیابی کے بارے میں بات شروع ہو ہی گئی ہے، تو آپ بتائیں آپ کے نزدیک

کامیابی کیا ہے؟“

”کامیابی وہ ہے جو سرچڑھ کر بولے جس کے بارے میں، میں نہیں دُنیا بات کرے۔ لوگ

آپ جیسا بننے کے لیے آپ سے جلیس ہوں۔ میں envy کی بات نہیں کر رہا جلیسی کی بات کر رہا ہوں۔ اسٹیج پر آپ کھڑے ہوں اور نیچے دُنیا کا ہر شخص آپ کا دشمن۔“

رشنا کو لگا وہ مذاق کر رہا ہے، مگر اُس کے چہرے کا اطمینان رشنا کے اس اندازے کی نفی کر رہا تھا۔

”کامیابی کی مدّت ہوتی ہے اور مدّت گزر جاتی ہے۔“ رشنا نے جیسے اُسے یاد دہانی کرائی۔

”پھر دشمنوں اور حاسدین کے اس گروہ کا آپ کیا کریں گے۔“

”پھر یہ میرے ساتھ نہیں ہوں گے۔ اگلے کامیاب آدمی کے پیچھے ہوں گے۔“ وہ اُسی طرح

اطمینان سے مسکرایا۔ رشنا اُس کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوئی۔

”آج ایوارڈز ہو رہے ہیں اور آپ اور آپ کی فلم nominated ہے۔ کیا توقعات ہیں؟“

رشنا نے آخری سوال کیا۔

"I will win all." قلب مومن نے اُسی پر اعتماد لہجے اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو

رشنا کو اُس کا شناختی نشان لگی تھی۔

”اور اگر نہ جیت سکے تو؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

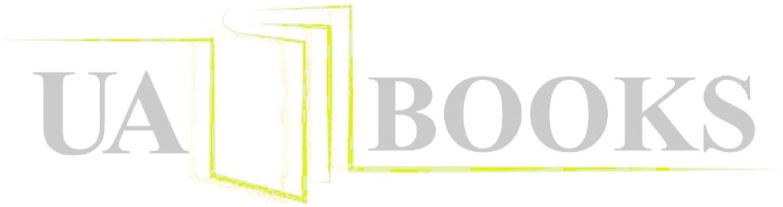
"I will boycott the awards." اُسی روانی اور اطمینان سے جواب آیا۔

”یہ fair play تو نہیں ہے۔“ رُشنا نے بے ساختہ کہا۔

”میں fair play پر یقین بھی نہیں رکھتا۔“

قلب مومن نے مسکراتے ہوئے اپنے کالر سے مائیک اُتارتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆



ہال ایک thunderous applause سے گونج اٹھا تھا۔

چھت میں لگی سپاٹ لائٹس نے فرنٹ سیٹ میں بیٹھے بے حد تیکھے نین نقش اور سفید رنگت والے چھت سے نکلنے قد کے مالک قلب مومن کو فوکس کیا۔ جواب نشست سے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی بلیک ڈنر جیکٹ کے بٹن بند کرتے اپنے دائیں بائیں بیٹھی اپنی فلم کی کاسٹ سے ہاتھ ملاتے گلے لگاتے high five بناتے اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا اور اُس کے عقب میں اُس ہال میں بیٹھی ہر عمر کی اداکارہ کی نظروں کو مقناطیس کی طرح اپنے وجود کے ساتھ کھینچتے ہوئے لے جا رہا تھا۔

یہ ناممکن تھا کہ قلب مومن اُن سب کی توجہ کا مرکز نہ بنتا۔ وہاں اُس ہال میں بیٹھی ہر وہ ایکٹریس جو اُس کے ساتھ کام کر چکی تھی وہ اُس کے لیے تالیاں بجاتی اُسے چیئر کرتی انڈسٹری کے سب سے کامیاب نوجوان فلم ڈائریکٹر کو اپنی سپورٹ کا یقین دلارہی تھی اور اُس کے ساتھ کام کرنے کی خواہشمند۔ ہر نوجوان اداکارہ اُس کے لیے تالیاں پیٹتے جیسے اُس کی مرکز نگاہ بننا چاہتی تھی۔ وہ اب اسٹیج پر پہنچ کر ایوارڈ ریسیو کرنے کے بعد روسٹرم کے پیچھے کھڑا تالیوں کے تھمنے کے انتظار میں تھا۔ جو بجتی ہی چلی جا رہی تھیں اور وہ کچھ mischievous مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا ایوارڈ روسٹرم پر دھرے اپنے منہ کے سامنے دُرسٹ کرنے میں مصروف تھا۔

وہ رات قلب مومن کی رات تھی اور پچھلے تین سال سے پاکستان کے اُس سب سے بڑے فلم ایوارڈ شو کی ہر رات قلب مومن ہی کے نام ٹھہر رہی تھی اور کسی کے لیے وہاں بیٹھے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

تالیوں کی گونج بالآخر تھی تو قلب مومن نے بات شروع کی۔ امریکن لب و لہجے میں بولی جانے والی انگلش میں اُس نے وہاں بیٹھے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنے اور اپنی فلم کے لیے پاپلرووٹ دینے والے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی کاسٹ کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے بعد اُس نے اُس ایوارڈ شو کی انتظامیہ پر بجلی گراتے ہوئے ایوارڈز کی جیوری کو بری طرح رگیدا کیوں کہ اس سال پہلی بار اُس کی فلم تمام nominations نہیں جیت سکی تھی۔

بیسٹ ٹائٹل ٹریک قلب مومن کے دیرینہ حریف احسن ملک کی فلم کو دے دیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بیسٹ سینما ٹوگرافی کا ایوارڈ بھی اُسی کی فلم کو دیا گیا اور قلب مومن یہ ہضم نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے

لیے جیتنے والے چھ ایوارڈز سے زیادہ اہم ہارنے والے دو ایوارڈز تھے۔

اسٹیج پر کھڑا وہ ایوارڈ شو کی انتظامیہ اور جیوری دونوں کی بُری judgement پر اعتراض نہیں کر رہا تھا وہ ان کی partiality کی بات بھی کر رہا تھا اور ہال کو اس وقت سانپ سونگھا ہوا تھا۔ وہ ایوارڈ شولا نیو نہیں جا رہا تھا ورنہ اُس شو کی انتظامیہ جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے منسلک تھی اُس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ بڑی آسانی سے ایوارڈ شو کو ایڈٹ کر کے قلب مومن کی تنقید والا حصہ حذف کر سکتے تھے، مگر قلب مومن کی اتنی کھلی تنقید اور وہ بھی اس پوری انڈسٹری کے سامنے جس میں سے کوئی بھی اُس ایوارڈ شو کی انتظامیہ کے سامنے منہ تو کیا زبان بھی ہلا نہیں سکتا تھا۔ اُس کمپنی کی بیک اسٹیج اور فرنٹ رو میں بیٹھی ہوئی انتظامیہ کو ہضم نہیں ہوئی تھی، مگر کوئی مائی کال لعل انڈسٹری کے سب سے بگڑے اور کامیاب ڈائریکٹر کو چپ کروانے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

قلب مومن نے یہ تقریر ختم کرنے کے بعد اپنا ایوارڈ اٹھا کر اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف واپس جانا شروع کیا، تو نہ صرف ہال میں ایک بار پھرتالیوں کا شور گونجنے لگا بلکہ انتظامیہ کی جان میں جان بھی آگئی تھی۔

سپاٹ لائٹس اسٹیج سے اُس کی سیٹ تک اُس کے سفر کو تب تک کور کرتی ہیں جب تک وہ دوبارہ اپنی کرسی پر نہ بیٹھ گیا اور تالیاں تب تک بجتی رہیں جب تک اسٹیج پر اگلی کیٹگری کی اناؤنسمنٹ نہ شروع ہوگئی تھی۔

وہ سب جو قلب مومن اسٹیج پر کہہ کر آیا تھا صرف قلب مومن ہی کہہ سکتا تھا اور وہ انتظامیہ صرف قلب مومن سے ہی سن سکتی تھی۔

قلب مومن اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا تو ہال میں بیٹھے ہوئے بہت سے اداکار اور اداکارائیں اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر اُس کے قریب آ کر اُسے مبارکبادیں دینے لگے تھے۔ وہ اس وقت وہاں بادشاہ کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ بادشاہ کو کورنش بجانہ لائی جائے۔

”مومن..... مومن..... کوئی مسئلہ ہو گیا؟“ اُس ملٹی نیشنل کمپنی کی اہم خاتون عہدے دار تقریباً بھاگتی ہوئی پھولے سانس کے ساتھ مومن کی سیٹ پر پہنچی تھی۔ وہ بے حد معذرت خواہانہ اور مدافعانہ انداز اپنائے ہوئے تھی۔ اور اُن دو ایوارڈز کو جو قلب مومن کی فلم کے بجائے ایک دوسری فلم کو دیے گئے تھے اُس کے لیے وہ وضاحتوں پر وضاحتیں دے رہی تھی۔ اسٹیج پر اگلی کیٹگری سے پہلے ایک پرفارمنس کا اعلان ہو رہا تھا اور فرنٹ رو میں قلب مومن کو صفائیاں اور وضاحتیں دیتے ہوئے اُس برانڈ سے منسلک لوگوں کا

آخری ایوارڈ سیٹ فلم کا تھا اور وہ ایوارڈ اگر قلب مومن کے علاوہ کسی دوسرے کی فلم کو ملتا، تو قلب مومن وہاں کھڑے کھڑے انتظامیہ کو سولی پر لٹکا دیتا۔

وہ متکبر تھا..... متکبر چھوٹا لفظ تھا..... منتقم مزاج تھا اور اُسے اپنا حق سمجھتا تھا۔ زود رنج تھا اور اسے ضروری سمجھتا تھا۔ اپنے آرٹ کو سب سے برتر سمجھتا تھا اور اپنے ٹیلنٹ کو لاثانی۔ وہ اس انڈسٹری کے لوگوں کے ساتھ وہی کرتا تھا جو اُس انڈسٹری کے لوگ کم کامیاب لوگوں کے ساتھ کرتے تھے۔ فلم انڈسٹری نام کی پوجا کرتی ہے اور قلب مومن کا نام ہی کافی تھا۔ فلم انڈسٹری کامیابی کے سکے کے علاوہ کسی اور سکے کو نہیں مانتی تو اُس سکے پر آج کل قلب مومن کا نام اور شہیہ کھدی ہوئی تھی اور فلم انڈسٹری اگر ستارہ پرست تھی تو قلب مومن کے علاوہ پچھلے تین سال میں آسمان پر کسی ڈائریکٹر کا ستارہ نہیں چمکا تھا۔

تو قلب مومن کو اگر گھمنڈ ہوتا، تو کیوں نہ ہوتا۔ وہ اگر ہر ایوارڈ کو چھین کر بھی لے جاتا، تو کیوں نہ لے جاتا اور وہ نازنخرہ دکھایا تھا، تو کیوں نہ دکھاتا۔ جب اُس کی ہر فلم باکس آفس پر بزنس کے نئے ریکارڈز بنا رہی تھی اور ہر پروڈیوسر اُس کے ساتھ فلم فنانس کرنے کے لئے پاگل ہو رہا تھا اور ہر اداکار اور اداکارہ اُس کے کام کرنے کے لیے اُس کے آفس کے چکر کاٹ رہے تھے۔ اگر عروج ہما تھا تو یہ ہما قلب مومن کے سر پر بیٹھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆



وہ اپنی لائزنگ سے یاد کیے اب سیٹ پر ہیروئن کے انتظار میں ٹیم کے دوسرے لوگوں کی طرح بیٹھی تھی۔ یہ اُس سیٹ پر تقریباً روز کا معمول تھا۔ ثانوی کرداروں میں کام کرنے والے وقت سے بھی بہت پہلے سیٹ پر موجود ہوتے اور مرکزی کردار کرنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو اپنی عدم موجودگی سے کھپا رہا ہوتا۔

سیٹ کے ایک کونے میں وہ ثانوی کردار کرنے والی چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سیٹ پر چائے دی جا رہی تھی اور وہ سب بھی اپنا اپنا چائے کا کپ پکڑے اُس کونے میں گپ شپ میں مصروف تھیں۔ اُن کی گپ شپ اپنے کیرئیر کے بارے میں اُن کی پلاننگ اُن کے آنے والے پروڈیکٹس اور حال میں مختلف سیٹس پر ہونے والے تجربات کے علاوہ بڑے سٹارز کے بارے میں سنی سنائی افواہوں کو چشم دید رپورٹ میں تبدیل کر کے پیش کرنا ہوتا تھا۔ مسالے دار چٹ پٹی خبریں جنہیں سنا کر اُنہیں یہ تسلی رہتی تھی کہ سب ”انسان“ ہی ہیں اور سب گڑھے کھودتے اور ان میں گرتے رہتے ہیں۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس وقت بھی ایسا ہی ایک gossip session ہو رہا تھا اور مومنہ چپ چاپ بیٹھی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سب خبریں سن رہی تھی جو اُس کے کانوں سے کہیں آگے دماغ میں رجسٹر ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ دماغ میں اپنے ہی بکھیڑے تھے، اپنے ہی مسئلے اور وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اور اُن کی باتیں سنتے ہوئے وہ پورے مہینے کا گھر کا بجٹ بناتی رہتی تھی اور جہانگیر کے اخراجات۔

اُس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ڈائریکٹر کو یک دم فون پر اُس سیریل کی ہیروئن سے بات کرتے سنا جو ”عادتاً“ لیٹ تھی اور جس کے ساتھ مومنہ کا اگلا سین تھا اور اُس ایک سین کے لیے مومنہ سلطان صبح سے آکر بیٹھی ہوئی تھی اور ہیروئن ندارد۔

”نشا ایک اور گھنٹہ لیٹ ہوئی نا تو پورا دن ضائع ہو جائے گا ہمارا۔ چار گھنٹے کے لیے آؤں گی تو کتنے سیزنگالیں گے ہم..... پلیز آ جاؤ اب..... پروڈیوسر نے مجھے پاگل کر رکھا ہے یہاں..... پلیز۔“ مومنہ نے ڈائریکٹر کو تقریباً بے چارگی کے عالم میں گڑ گڑاتے سنا تھا۔ وہ اب فون بند کر کے اسٹنٹ سے کہہ رہا تھا۔

”آ رہی ہے نشا..... تم ریہرسلز کرواؤ۔“ اسٹنٹ نے کچھ جھنجھلا کر ڈائریکٹر سے کہا تھا۔ ”کتنی ریہرسلز کرواؤں صبح سے ریہرسلز ہی ہو رہی ہیں۔“ مومنہ نے اسٹنٹ کو بھی جھنجھلاتے دیکھا اور چائے کا خالی کپ اکٹھے کرتے سپاٹ بوائے کو سونپ دیا۔

”بس ہمیں بٹھا چھوڑتے ہیں تین تین گھنٹے کے لیے۔“ اُس نے اپنے برابر بیٹھی ایک ایکسٹرا لڑکی کو کہتے سنا۔

”قسمت کہتے ہیں اسے۔“ اس نے دوسری کا جواب سنا۔ وہ ایک خاموش تماشائی تھی اور ایسے مواقع پر تو جیسے اُس کے سارے لفظ ہی کہیں گم ہو جاتے تھے۔ کسی بھی سیٹ پر سب سے بے ضرر وجود مومنہ سلطان ہی کا ہوتا تھا۔ اُس کی کسی چیز کے بارے میں کوئی رائے نہیں ہوتی تھی۔ ہوتی بھی تھی تو وہ اُس کی زبان سے باہر نہیں آتی تھی۔ شکایت کرنے کی اُسے عادت کبھی رہی ہی نہیں تھی اور اب ان حالات میں شکایت کرنا تو وہ فورڈ کر نہیں سکتی تھی اور وقت اُس کے پاس بہت تھا۔ آج اُن دنوں میں سے ایک تھا جب اُسے ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پہنچنے کے لیے بھاگنا نہیں تھا۔ یہ پہلا سیریل تھا جو وہ کر رہی تھی اور اسے سیریل کرنا کہنا شاید کچھ لفاظی ہوتی۔ وہ ہیروئن کی ایک دوست کا رول کر رہی تھی جس کے پاس صرف 12 سین تھے۔ 24 اقساط کے اس سیریل میں۔

سیٹ پر یک دم کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ ہیروئن بالآخر آن پہنچی جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ مومنہ نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ اب بالآخر وہ سین کروا کے گھر جاسکتی تھی۔

”مومنہ آکر ریہرسل کرو۔ تمہارا سین ہوگا پہلے۔“ اسٹنٹ نے اُسے پکارتے ہوئے کہا۔ وہ برق رفتاری سے اُٹھی اور سیٹ کے اُس حصے میں چلی گئی جہاں نشا اپنے بال بنوا رہی تھی۔ وہ میک اپ کروا کر آئی تھی اس لیے ڈائریکٹر خوش تھا کہ وقت بچ گیا تھا۔

”ہائے۔“ اُس نے مومنہ کے سلام کے جواب میں ایک ہلکی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ساتھ جمنا ہی لیتے ہوئے اسٹنٹ سے کہا۔

”چائے پلوادو..... تاکہ آنکھیں تو کھلیں میری۔“ اسٹنٹ نے بجلی کی رفتار سے سپاٹ بوائے کو دوڑایا تھا۔ ”ہاں بال ٹھیک ہیں اب میرے.....“ بائیں کندھے پر ڈالو۔“ نشا اب میک اپ آرٹسٹ سے کہہ رہی تھی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ساتھ لپ اسٹک بھی دیکھ رہی تھی۔

”ڈائلاگز یاد ہیں آپ کو؟“ اسٹنٹ کو مومنہ کو کھڑے دیکھ کر اچانک یاد آیا کہ اُسے کس لیے بلوایا گیا تھا۔ ”ڈائلاگز کیا گھر سے یاد کر کے نکلوں گی میں؟ میں نے تو اسکرپٹ دیکھا تک نہیں ابھی۔ بس یہ پتا ہے کہ رول کیا ہے میرا۔“ نشانے اُسی بے زار اور تیکھے انداز میں جمنا ہی لیتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلی رات ہی بیرون ملک سے چھٹیاں گزار کر آئی تھی اور اب اگلی صبح ہی سیٹ پر آکر شوٹنگ کروانا..... وہ اپنی

”مومنہ تم ذرا لائنز دہراؤ اپنی..... میں میڈم کی دہراتا ہوں۔“ اسٹنٹ نے مومنہ سے کہا تھا۔ نشا اسٹنٹ پر تپی۔

”چائے تو پینے دو مجھے۔ آرٹسٹ ہوں میں اور وہ بھی سیریل کی مین لیڈ..... مزدوروں کی طرح ٹریٹ مت کرو مجھے۔“ مومنہ اور اسٹنٹ ایک دوسرے کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ہکا بکا ہو گئے۔ اسٹنٹ نے فوری طور پر نشا سے معذرت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ اس فیلڈ میں بغیر غلطی کے ان معذرتوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا جیسے کسی جھگڑا لوسرال میں آنے والی غریب خاندان کی بہو جس کی زبان پر سلام کے بعد پہلا جملہ معاف کر دیں ہوتا ہے۔

نشا کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ وہ اب چائے کی چسکیاں لے رہی تھی اور مومنہ اب بھی کھڑی تھی اسکرپٹ ہاتھ میں لئے۔

”اچھا ذرا دہراؤ میری لائنز۔“ اس نے بالآخر چائے کا کپ خالی کر کے سپاٹ بوائے کو تھمایا۔ میک اپ آرٹسٹ سے ایک بار پھر برش اور puffing کروائی اور پھر اسٹنٹ سے پوچھا جو طوطے کی طرح اُس کے جملے دہرانے لگا تھا۔ پندرہ منٹ وہ اُسے جملے یاد کرواتا رہا اور مومنہ وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ اب پچھلے آدھ گھنٹہ سے بغیر مقصد کے وہاں کھڑی تھی لیکن وہ کسی سے نشا کی طرح یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اُسے بلا وجہ کیوں وہاں کھڑا کیا گیا ہے جب کہ سین ابھی تیار ہی نہیں ہے۔ وہ ثانوی کردار تھی اپنی حیثیت اور اوقات جانتی تھی اور یہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈائریکٹر اور اسٹنٹ نشا کی ساری فرسٹریشن اُس پر اُتاریں۔

پندرہ منٹ بعد بالآخر نشا کو ڈائلاگ یاد ہو گئے اور وہ اب سین کے لیے تیار تھی۔ ایکشن کی کیو کے ساتھ ہی مومنہ نے اپنی لائنز بولنا شروع کر دیں۔

”میں تمہاری دوست ہوں تم اس طرح کے الزامات نہیں لگا سکتی مجھ پر وہ بھی صفائی کا موقع دیے بغیر۔“ اُس نے نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے ڈائلاگز بولے۔ وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔

”میرے بس میں ہو تو، تمہیں جان سے مار دوں۔“ نشا نے جواباً غصے میں کہا۔ مومنہ نے یک دم اُس کے ہاتھ پکڑے اور اپنی گردن تک لاتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

”مار دو..... اگر میرے مر جانے سے دوستی بچ جاتی ہے، تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔“ نشا نے اُس

سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ اتنا بڑا راز..... cut کریں۔“ نشا اپنے ڈائلاگز آخری منٹ میں بھول گئی اور اُس نے ایک دم سین cut کروایا تھا۔ ڈائریکٹر اور DOP بے اختیار جھنجھلا گئے۔ سین ختم ہوتے ہوئے خراب ہو گیا تھا۔

”ڈائلاگ دہراؤ میڈم کے۔“ ڈائریکٹر نے اسٹنٹ سے کہا، مگر اس سے پہلے کہ اسٹنٹ کچھ کہتا نشانے بے حد خفگی سے کہا۔

”ڈائلاگز ہیں ہی، بکواس میرے..... ساری لائنز اس کو دی ہوئی ہیں۔ مجھے بس ”اتنا بڑا راز“ دے کر بٹھایا ہوا ہے۔ ڈائلاگ کم کریں اُس کے ڈائریکٹر صاحب۔ وہ میرا سین کھا رہی ہے، آپ کو نظر نہیں آ رہا۔“

مومنہ ہکا بکا کھڑی تھی اور ایسا ہی حال crew اور ڈائریکٹر کا تھا۔ مومنہ کا خیال تھا وہ اپنے ڈائلاگز بھولنے کی وجہ سے شرمندگی میں یہ سب کہہ رہی ہے۔ اُسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اُس کی پرفارمنس اور ایکسپریشنز سے پریشان ہوئی تھی۔ نشانی نئی دو فلز کر کے آئی تھی۔ سیریلز کرتے کرتے اور فلم کی طرح وہ بھی آتے ہی مقابل کے ڈائلاگ کٹوانے بیٹھ گئی تھی۔ یہ سٹار پاور تھی اور مومنہ بے چارگی کے عالم میں سین فریم کے اندر ویسے کی ویسے ہی کھڑی تھی۔

تھوڑی دور DOP مانیٹر پر اسی فریم کی فوٹیج ڈائریکٹر کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں آپ کی جگہ ہوتا تو مومنہ ہی کو کاسٹ کر لیتا۔ نشا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ اُس کا سین کھا رہی ہے۔ وہ سب کا سین کھا جاتی ہے۔ چاہے بہن بنا کر کھڑا کر دو چاہے نوکرانی۔ مومنہ کے ایکسپریشن کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔“ DOP اُسے داد دے رہا تھا اور بہت کھلے دل سے دے رہا تھا جب کہ ڈائریکٹر پریشانی سے اُس سے کہہ رہا تھا۔

”پتا ہے مجھے پرفارمر ہے وہ مگر نشا براؤنڈ ہے۔“

”سیریل براؤنڈ نیم سے بکتا ہے پرفارمنس سے نہیں۔ میں لاتا ہوں منا کر نشا کو۔ طاہر تم اسکرپٹ دیکھو۔ مومنہ کی لائنز کم کر دو بلکہ نشا میڈم کے پاس لے آؤ وہ خود ہی کم کر دیں گی۔“ مومنہ نے اتنی دور سے بھی اسٹنٹ اور ڈائریکٹر کے درمیان بلند آواز سے ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ گفتگو کو اُس کے کانوں تک نہ پہنچنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ انڈسٹری میں عزت، نخرہ اور انا صرف main lead کی دیکھی جاتی ہے۔ باقی سب یہ چیزیں گھر چھوڑ کر سیٹ پر آتے ہیں۔ کسی سینئر ایکٹریس نے ایک بار



اُس کے گھر کی گلی خاصی طویل، تنگ، ٹوٹی پھوٹی اور بے حد گندی تھی۔ نہ وہاں کوئی کوڑا اٹھانے آتا تھا نہ نالی صاف کرنے اور یہ کام اُس دن ہوتا جب مکینوں کا میونسپلٹی کے جمعداروں سے لڑائی جھگڑا گالی گلوچ ہوتی اور پھر محلے والے مل کر جمعدار کے خلاف درخواست دیتے اور اُس دن میونسپل کمیٹی کسی نہ کسی کو صفائی کے لیے بھیج دیتی۔ یہ سالوں سے ہو رہا تھا۔ نہ جمعدار کی ڈھٹائی میں تبدیلی آئی تھی نہ محلے والوں کی ثابت قدمی اور بے نیازی میں۔

وہ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں صرف دو سین کرواسکی اور تین بسیں بدل کر تھکی ہاری اپنی گلی میں شام سے کچھ پہلے داخل ہوئی تھی۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور ایک لمحہ کو اس کا دل چاہا وہ اسی گلی میں سونے کے لیے لیٹ جائے اور گلی میں اگر جگہ جگہ اُسے گندگی نظر نہ آتی تو شاید وہ یہ کربھی بیٹھتی۔ آج اُس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔

سامنے سے آتے جھومر نے اُسے دیکھتے ہی تالیاں بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

”ہماری ہیروئن آگئی۔“ وہ مسکرا بھی نہیں سکی۔ اس محلے میں فی الحال اُس کے علاوہ کوئی بھی

TV میں کام کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے جھومر اُسے بلاوجہ محلے کی شان بنائے بیٹھا تھا۔

”السلام علیکم مومنہ باجی! میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ اُس نے مومنہ کو سلام کرتے ہی جیسے اُس

سے اپنی ”تیار یوں“ کی داد لینا چاہی۔

”ہمیشہ اچھی لگتی ہو جھومر۔“ اس نے غور کیے بغیر اُسے کہا۔ وہ رُک کر مزید بات چیت نہیں کرنا

چاہتی تھی جو جھومر کی خواہش رہتی تھی۔

”بس مومنہ باجی آپ سٹار ہیں، تو نظر بھی آپ کی سٹاروں والی ہے۔ باقی اس محلے میں تو کوئی

آپ جیسا ہے ہی نہیں۔ اسی لیے تو آپ پر اتنا بھروسہ کرتی ہے جھومر۔“ جھومر نے بولنا شروع کیا اپنا دوپٹا

گلے میں سیدھا کرتے اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے اُسے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ مومنہ اُس کے پاس

کھڑی بھی ہے یا نہیں اور جب اس نے دیکھا مومنہ جا چکی تھی۔

”مومنہ..... مومنہ.....“ وہ اپنے گھر کے دروازے سے ابھی بہت فاصلے پر تھی۔ جب اپنے

عقب میں کسی کو اپنا نام پکارتے سنا۔ وہ بے اختیار پلٹی ایک مڈل ایجڈ چھوٹے قد اور بھاری وجود کی عورت

پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اُس کی طرف آرہی تھی۔ وہ مالک مکان تھی اور بہت دیر سے اُس کا

تعاقب کر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مومنہ کو یاد آیا کہ اس نے ابھی اس مہینے کا کرایہ دینا تھا۔ ذہن میں کوئی بہانہ ڈھونڈتے ہوئے اس نے مالک مکان کو سلام کیا جواب اُس کے قریب آگئی تھی۔
 ”السلام علیکم عذرا باجی۔“

”وعلیکم السلام۔ اُف تم نے تو دوڑ لگوا دی۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں تمہیں۔ پر مجال ہے تم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا ہو۔“ اُس عورت نے بڑی خوش دلی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے گلہ کیا۔
 ”بڑی معذرت میں نے آواز سنی نہیں آپ کی۔“ مومنہ نے مالک مکان سے کہا۔

”ہاں ہاں بھئی سٹار ہو تم کہاں سنو گی ہمارے جیسوں کی آوازیں؟ ثریا سے کہہ رہی تھی کیا ایکٹنگ کرتی ہے تمہاری بیٹی ماشاء اللہ۔ سوپ دیکھ رہی ہوں تمہارا۔“ عذرا نے پھولی ہوئی سانس بحال بغیر اُس کی تعریفیں شروع کر دی تھیں۔ مومنہ کچھ ریلیکس ہوئی اس کا مطلب تھا فی الحال کرائے کے لیے کچھ دن اور مل سکتے ہیں۔

”بہت شکریہ خالہ بس آپ کا پیار ہے۔“ اُس نے انکسار سے کہا۔
 ”بس اب سوپ وغیرہ چھوڑو اور کوئی سیریل کرو..... کوئی بڑا رول۔“ انہوں نے ساتھ ہی مشورہ دیا۔

”جی آج کل ایک سیریل بھی کر رہی ہوں۔“ اُس نے ایک طرح سے انکشاف کیا۔ اگر انہیں مرعوب کرنے سے کچھ اور دن مل جائیں کرایہ دینے کے لیے تو کیا برا تھا۔
 ”ارے واہ، یہ تو بڑی خبر ہے۔ کون کون ہے سیریل میں؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔
 ”نشا ہے؟“

”اور تمہارا کیا رول ہے؟“
 ”چھوٹا رول ہے خالہ۔“
 ”چلو کوئی بات نہیں بڑا بھی ملے گا۔ نشاء کو میرا بتانا کہ میں فین ہوں اُس کی۔“

”جی ضرور۔“ مومنہ نے حامی بھر لی۔

”ارے ہاں جس بات کے لیے تمہیں روکا تھا۔ وہ تو ذہن میں ہی نہیں رہی۔“ وہ بالآخر مدعا پر آگئیں۔

”تمہارے گھر گئی تھی۔ جہانگیر کو دیکھا تو بڑا افسوس ہوا۔ جہانگیر سامنے تھا، تو ثریا سے کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔“ ان کے چہرے پر اب ہمدردی کے تاثرات تھے۔ ”مجھے پتا ہے خالہ کرایہ لیٹ ہو گیا

ہے اس بار بھی، لیکن میں ایک ہفتہ تک دے دیتی دوں گی آپ کو..... اس ہفتے سیریل کا چیک مل جائے گا۔ اُس نے بڑے نادم انداز میں اُن سے کہا۔

”نہیں نہیں کرائے کی تو کوئی بات نہیں ہے وہ دے دینا تم..... مجھے اصل میں گھر خالی کروانا ہے۔“ وہ قدرے جھجک کر بولیں۔ ایک لمحہ کے لیے مومنہ کی سانس رُکی۔

”گھر خالی کروانا ہے؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”ہاں بیٹا وہ بس میرا بیٹا اپنا گھر بنوا رہا ہے تو پیسے کم پڑ گئے ہیں۔ اس لیے اب یہ والا گھر بیچنا پڑے گا۔“ انہوں نے وضاحت دی۔

”لیکن خالہ اتنا چانک.....“ وہ بے حد پریشان ہو گئی۔

”نہیں..... نہیں وقت تو دیں گے تمہیں۔ مہینہ دو مہینہ..... آرام سے گھر ڈھونڈو۔ آخر میں فین ہوں تمہاری۔ میں اب پھر چلتی ہوں درزی کے پاس بھی جانا ہے مجھے اور سیریل جب چلنا شروع ہو تو ضرور بتانا۔ اوکے خدا حافظ۔ وہ اُسی طرح تیز تیز کہتی ہوئی چلی گئیں اور مومنہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ ہوں ہاں بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ واقعی منحوس دن تھا، مگر اُس کی زندگی میں ایسے دنوں کی اتنی بھر مارتھی کہ اُسے اب اُن کی شناخت بھی بھول گئی تھی۔

تو اب یہ ایک اور مسئلہ ہوگا، نیا گھر ڈھونڈنا۔ اُس نے چلنا شروع کر دیا۔ اپنے گھر کے کھلے دروازے کے آگے لگتا پردہ ہٹا کر اُس کا دل چاہا وہ وہیں گر جائے کسی میرا تھن میں حصہ لینے والے رنر کی طرح جو فٹنگ لائن تک پہنچتے پہنچتے ڈھے جانے کی خواہش جیتنے کی خواہش سے زیادہ کرنے لگتا ہے۔ اپنا بیگ صحن میں بچھی چار پائی پر پھینکتے ہوئے اُس نے صحن کے کونے میں لگے بیسن کا نکا کھول کر چہرے پر چھینٹے مارنا چاہے اور نلکے سے ”غراہٹوں“ کے علاوہ کچھ برا مد نہیں ہوا۔ اُس کا دل عجیب طرح سے ڈوبا وہ اس وقت پسینے سے شرابور تھی اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد غسل خانے میں جا کر نہانا چاہتی تھی..... مگر پانی ہی نہیں تھا۔

اُس نے صحن میں کپڑے دھونے والی جگہ پڑی بالٹی دیکھی جو بھری ہوئی تھی۔ پھر پانی سے منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔

”پانی کی پائپ لائن پھٹ گئی ہے وہاں سڑک پر..... پورے محلے والے جمع ہیں۔ صبح سے وہیں سے پانی لا رہے ہیں۔ اب دیکھو کب ٹھیک کرتے ہیں میونسپل کمیٹی والے۔“ اُس نے اپنے عقب میں اچانک ثریا کی آواز سنی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اُس نے اپنے چھوٹے بھائی جہانگیر کی بھی آواز

”آپا تم آگئیں.....“ یہ جملہ وہ ہر روز اُس کے آنے پر کہتا تھا۔ اُس کے گھر داخل ہوتے ہی وہ اُس کے قدموں کی چاپ سن کر کمرے سے باہر آ جاتا۔ اُس سے دن بھر کی کارگزاری سننے کے لیے..... شوٹنگ پر ہونے والے واقعات کس نے کس سے کیا کہا، کون کس سے لڑا، کون کس کے ساتھ افیئر چلا رہا ہے، کون فلرٹ کر رہا ہے، اس کی پرفارمنس نے کتنوں کو متاثر کیا اور سین میں کس کس نے اُسے داد دی۔ اُس کا سوالنامہ روز ایک جیسا ہوتا تھا، مگر مومنہ کو روز نئے سرے سے اُس کی تیاری کرنا پڑتی تھی۔ باہر اور شوبز کی دُنیا کے ساتھ وہ جہانگیر انٹر ایکشن کا واحد ذریعہ رکھ گئی تھی اور وہ اُسے entertained رکھنا چاہتی تھی۔

تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ جہانگیر کے سوال کے جواب میں اُس کا جواب بھی جہانگیر نے یقیناً رٹا ہوا ہوگا۔ وہ اُس کے سوال کا جواب ہمیشہ اس سوال سے دیا کرتی تھی اور پھر اُس کا جواب جہانگیر کی زبان پر ڈھونڈنے کے بجائے اُس کے چہرے اور باڈی لینگویج سے ڈھونڈتی تھی کیوں کہ جہانگیر کی زبان پر ہمیشہ جھوٹ ہوتا تھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ اور وہ اُس کا چہرہ کھوجنے لگی۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا روز ہوتا تھا۔ وہی حلقے، وہی پھیک پھیک زرد رنگت، وہی سیاہ ہونٹ، وہی آنکھوں کے گرد سوجن، وہی مرجھائی ہوئی آنکھیں اور وہی کھڑے رہ پانے کی جدوجہد..... وہ گردوں کی بیماری کے باعث ڈائلا س کروا رہا تھا اور مومنہ سلطان رقم جمع کرنے میں مصروف تھی جس سے وہ اُس کا گردہ ٹرانسپلانٹ کروا لیتی۔ وہ ایک ہی وقت بہت سے محاذوں پر جنگیں لڑ رہی تھی اور ہر جنگ ہار رہی تھی۔

”آپا آج کیسا گزرا سیریل کے سیٹ پر تمہارا پہلا دن؟“ جہانگیر اُس کی کھوجتی آنکھوں کو خود سے ہٹانا چاہتا تھا۔ ”میں سو کے اٹھ جاؤں پھر بتاؤں گی۔“ اُس نے اندرونی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کھانا تو کھاتی جاؤ۔“ ثریا نے اُس سے کہا۔ ”وہ بھی سونے کے بعد۔“ اُس نے پلٹے بغیر ماں سے کہا تھا یہ پوچھے بغیر کہ پکا کیا تھا۔ دال، آلو، کدو، گوہی، چاول..... وہ مینو کی فہرست اور ترتیب سے واقف تھی اور اُسے یہ بھی پتا تھا کہ جب تک کرایہ ادا نہیں ہو جاتا، مینو میں گوشت کی اینٹری نہیں ہو سکتی اور وہ گوشت کی شوقین تھی بھی نہیں۔ ڈراموں کے سیٹس پر اُسے سب کچھ مل جاتا تھا۔ ثانوی کرداروں میں بھی اچھا کھانا یا کم از کم وہ کھانا جو اُس کے گھر سے بہتر ہوتا تھا اور کھانے کے بارے میں اب سوچنا بھی کون تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو وہ سوچتی تھی وہ کھانا کھانے کے بارے میں تھا..... کیا کھانے

چادر کو چہرے پر کھینچتے ہی وہ جیسے سکون کی وادی میں اتر گئی تھی۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر خود پر تان کر چٹ سویا کرتی تھی۔ وہ چادر نما خیمہ جیسے اُس کی حفاظتی بار تھی جو کچھ لمحوں کے لیے اُسے ہر چیز سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ اُس چادر کے اندر اُسے اپنے وجود کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نہ گھر کی دیواروں سے اترتا سیمنٹ یا برسات میں چھت سے ٹپکتا پانی، نہ گھر کا مرمت طلب فرنیچر نہ جہانگیر کا بیمار چہرہ، نہ ثریا کی مجبور نظریں نہ سلطان کی اُداس آنکھیں۔ اُس چادر کے اندر مومنہ سلطان کو صرف مومنہ سلطان نظر آتی تھی جو صرف اپنے ساتھ ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ چادر کے اندر آنکھیں کھولے اُس چادر کی چھت کو دیکھتی رہتی اور اُس خالی پن میں سکون محسوس کرتی تھی۔ جیسے کسی نے سلیٹ پر لکھی گڈ مڈ تحریریں کچھ دیر کے لیے ڈسٹر سے صاف کر کے مٹا دی ہوں اور سلیٹ بالکل خالی ہو۔

بچکے کی گھر گھر کی آواز ہوا کے ذریعہ اُس کی چادر کو ہلانے اور سہلانے میں مصروف تھی اور باہر صحن میں ثریا اور جہانگیر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اُس چادر کے اندر وہ بند آنکھوں سے اُن کی آوازیں سن رہی تھی۔

”مجھے پتا ہے پہلا سین دیکھتے ہی ڈائریکٹر اور سارے ایکٹر متاثر ہو گئے ہوں گے آپا سے..... شاید تالیاں بھی بجائی ہوں۔ ہو سکتا ہے اگلا سیریل بھی دینے کی بات کر رہے ہوں۔“ جہانگیر dreamer تھا اور اون سلائیوں کے ساتھ ایک خواب کے ادھڑے دھاگوں کے ساتھ دوسرا خواب بننے کا عادی تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے چادر کے اندر سوچ رہی تھی۔

”ہاں کوئی لمبی سیریل مل جائے تو تمہارا گردہ ٹرانسپلانٹ کروالیں گے فوراً..... سیریل کے پیسے بھی تو بہت ملتے ہیں ہیر و ہیر وئن کو۔“

اُس نے ثریا کی آواز سنی۔ مومنہ کی ہر کامیابی ثریا اور سلطان کے نزدیک جہانگیر کی زندگی بچانے کے قدموں کے طور پر گنی جاتی تھی۔ اب مومنہ یہ کرے گی تو جہانگیر کو یہ مل سکتا ہے، یہ کرے گی تو جہانگیر کے ساتھ یہ ہو جائے گا اور یہ ہوگا، تو وہ سانپ سیڑھی کا پورا بورڈ کسی سانپ کے زہر کا شکار ہوئے بغیر اپنے بھائی کے ساتھ پار کر جائے گی۔ وہ اس سے آگے کچھ سوچ نہیں پائی۔ نیند مہربان تھی اور زندگی نامہربان۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں اور پہلا احساس جو اُسے ہوا تھا وہ سر میں دھمک کا تھا۔ یہ رات کا hangover تھا..... after party effects..... وہ کچھ دیر اُسی طرح اپنے بیڈ پر ٹانگیں پسارے چپت لیٹا رہا۔ آنکھیں کھولتا بند کرتا رہا۔ اُس کے کانوں میں رات کی پارٹی کے DJ کا بجایا ہوا میوزک اب بھی گونج رہا تھا۔ Drum کی بلند beat..... اُس نے سر کو بے اختیار جھٹکایوں جیسے شور کو بھی سر سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے گلاس پیئٹ ہاؤس کی دیواروں اور کھڑکیوں سے اس وقت روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ وال کلاک 10 بج رہا تھا اور وہ روٹین میں اُس کے جاگنے کا وقت تھا۔ چاہے وہ ساری رات ہی کوئی پارٹی اٹینڈ کر کے آتا، لیکن دس بجے اُس کا باڈی کلاک اُسے کسی الارم کلاک کی طرح جگا دیتا تھا۔

بستر پر اُٹھ کر بیٹھا وہ چند لمحے پیئٹ ہاؤس کی شیشے کی دیواروں سے نظر آتا منظر دیکھتا رہا۔ 30 منزلہ عمارت کی اُس آخری منزل پر موجود پیئٹ ہاؤس میں صبح آنکھ کھلنے کے بعد وہ اسی طرح ہر روز بستر پر بیٹھا رہتا تھا۔ وہ اُس وقت انجانے میں زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرنے کے چند لمحے تھے جو ہر روز قلبِ مومن کی زندگی میں اُسی وقت آتے تھے۔ ساری رات پارٹیز میں وقت گزارنے کے بعد صبح hangover کی کیفیت میں آنکھ کھلنے کے بعد بستر پر بیٹھ کر پیئٹ ہاؤس کی گلاس والز سے نظر آنے والا سمندر اور اُس کے اوپر اڑتے پرندے دیکھنا۔ وہ منظر اُس کے پیئٹ ہاؤس سے بہت دور کا تھا اور وہ وہاں بیٹھے سمندر کی آواز نہیں سُن سکتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے اندر اُس منظر کو دیکھتے ہوئے سمندر کی موجوں اور لہروں کی حرکت کے ساتھ وہ شور بھی سنائی دیتا تھا جو اس وقت سمندر میں ہوتا۔

بستر سے اتر کر وہ لڑکھڑایا تھا۔ یہ لڑکھڑاہٹ بھی روٹین کی تھی۔ دو تین قدموں کے بعد وہ سنبھل جاتا آج بھی سنبھل گیا تھا۔

واش روم میں بیسن پر سر جھکائے وہ اپنے چہرے اور آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتا ہی چلا گیا۔ یوں جیسے اندر سر میں سنائی دینے والی دھمک کو روکنا چاہتا ہو یا دھود بٹا چاہتا ہو۔ پھر اُس نے سیدھا کھڑا ہو کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سُرخ puffy آنکھیں، ہلکی بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بال اور بھیگا ہوا چہرہ اور اُس چہرے سے نیچے گردن اور سینے تک آتی پانی کی باریک لکیریں۔ رات کی تھکاوٹ بھی آئینے میں نظر آنے والے مرد کی وجاہت کو دُھندلانے میں ناکام نظر آرہی تھی۔ اُس کے تیکھے نین نقش اُس کے عرب یا ترکش ہونے کی چغلی کھا رہے تھے یا کم از کم اس کے genes میں اُس ancestry کی موجودگی کا برملا اظہار کر رہے تھے۔

آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے وہاں لکھا اپنے پورے دن اور اگلی رات کا شیڈول پڑھ رہا تھا۔ اُس کی مصروفیات کی ایک لمبی قطار تھی اور وہ ذہنی طور پر اس وقت اُن میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

نائٹ سوٹ کی شرٹ پہنتا وہ باہر لاؤنج میں آ گیا تھا۔ جہاں دیوار پر اهدنا الصراۃ المستقیم کی وہی بڑے سائز کی painting دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ اُسی دیوار پر جس کے ساتھ وہ صوفہ پڑا جس پر بیٹھا وہ اس وقت TV آن کیے چینل سرفنگ میں مصروف تھا کسی میکائیکی انداز میں BBC سے فیشن چینلز اور وہاں سے اسپورٹس اور پھر دوبارہ BBC یا CNN اُس کی روز کی چینل روٹین بھی ایک جیسی ہی تھی۔ ملازم اُس کے باہر نکلنے اور بیٹھنے کے دوران اُس کے لیے کافی کا ایک گگ رکھ گیا تھا۔ سامنے ایک نیوز چینل پر اچانک رات کے ایوارڈ شو کی جھلکیاں دکھائی جانے لگیں تھیں۔ اُس نے آواز تھوڑی بلند کر دی۔ نیوز کاسٹر اُس کی فلم کے ایوارڈز کے حوالے سے خبر دے رہا تھا اور وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ایوارڈ لیتے ہوئے فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ تبھی اُس کا صوفے پر پڑا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے فون کی اسکرین پر چمکتا شبیلی کا نام دیکھا اور پھر LCD کی آواز ہلکی کرتے ہوئے فون کال ریسپوکی۔ وہ اُس کی پہلی فلم کی ہیروئن تھی۔

”ہیلو جان۔“ بے حد میٹھی اور بے حد familiar آواز میں اُس نے اُسے اُسی انداز سے مخاطب کیا تھا جس انداز سے وہ انڈسٹری کے ہر ہیرو اور ڈائریکٹر کو مخاطب کرتی تھی۔

”ہیلو شبیلی۔“ اُس نے جواباً اُسی casual ٹون میں اُسے مخاطب کیا جس میں ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

”اُف کیا کہوں تمہارے بارے میں تم نے تو بتا ہی مچادی رات کو ایوارڈز میں“ وہ اب اُسے مکھن لگانے کی مہم شروع کر چکی تھی۔

”ہم لوگ تو audience میں بیٹھے بس پہلے stunned تھے اور پھر تالیاں بجانے لگے تو بس بجاتے ہی گئے۔ میں نے تو کھڑے ہو کر تمہارے لیے clapping کی اور چیئر بھی کیا تم نے دیکھا۔“

اُس نے مومن سے پوچھا۔ اُس کی بات سننے کے دوران کافی پیتے ہوئے ریموٹ لیے چینل سرفنگ میں مصروف ہو چکا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا شبیلی بہت لمبی بات کرے گی۔

”نہیں کب؟“ وہ چونکا۔

”oh God you missed it.“ وہ بے اختیار مایوس ہوئی۔

”اگر اُن لوگوں نے ایڈٹ نہ کیا تو TV پر جب ایوارڈ شو چلے گا تو چلائیں گے تمہیں چیئر

کرتے ہوئے میری فوٹیج تم دیکھنا..... تم نے تو کیسی جرأت دکھائی کہ اُن کے منہ پر ہی اُنہیں Cheater بول دیا..... آج دیکھو ذرا نیوز پیپرز میں ایوارڈ سے زیادہ تمہاری اسپینچ کی کورتج ہے۔“ وہ قلبِ مومن کی جتنی تعریفیں کر سکتی تھی اس وقت کر رہی تھی کیوں کہ بد قسمتی سے پچھلی رات ایوارڈز کی آفٹر پارٹی میں وہ کوشش کے باوجود قلبِ مومن سے مل کر یہ سب نہیں کہہ پائی تھی کیوں کہ اُس ایوارڈ شو اور برانڈ جو اُس ایوارڈ کو سپانسر کر رہا تھا وہ مسلسل قلبِ مومن سے چپکے ہوئے اُسے وضاحتیں دے کر اُس کی خفگی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور شبلی اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اُس برانڈ کے نمائندوں کے سامنے وہ قلبِ مومن کو اس ”ڈلیری“ پر وہاں کھڑے داد دیتی۔

”میں نے ابھی نیوز پیپرز دیکھے نہیں ابھی دیکھتا ہوں۔“ اُس نے شبلی سے مختصر کہا۔ ”ارے وہ تم نے Dusk کا کور دیکھا؟“ شبلی کو اچانک یاد آیا۔ مومن نے سامنے پڑے ہوئے اُس میگزین Dusk پر ایک نظر دوڑائی اور کہا۔

”ہاں دیکھا ہے۔“

”میری تصویر کا سائز دیکھو..... باقی دونوں سے چھوٹا کر دیا ہے مجھے۔“ شبلی نے لمحہ بھی ضائع کیے بغیر شکایت کی۔ مومن نے کچھ سمجھے بغیر میگزین اٹھا لیا اور اُس کو رو دیکھنے لگا جس پر اُس کے ساتھ اُس کی پچھلی تین فلموں کی ہیر و ہنز کی بے حد مختصر ملبوسات میں تصاویر تھیں اور اوپر ایک heading میں The Queen Maker لکھا ہوا تھا۔

مومن نے ایک نظر کور پر ڈال کر میگزین کو دوبارہ ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاف انچ ہی چھوٹی ہوگی اگر ہوئی بھی تو۔“ دوسری طرف اُس کے جملے پر شبلی جیسے چلا اٹھی تھی۔

”ہاف انچ بھی کیوں چھوٹی ہوئی میری پکچر..... کس کی فلم ہٹ ہوئی ہے اس سال.....؟“ میری..... اور تصویر کس کی چھوٹی دے رہے ہیں؟..... وہ بھی میری؟“ مومن نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم پروامت کرو۔“

”کیسے پروا نہ کروں۔ مجھے کیا پتا نہیں کہ Dusk کے ایڈیٹر کی نیت کیا ہے اور کس طرح وہ لینا کو پروموٹ کر رہے ہیں۔“ شبلی نے اُس کو ر میں موجود ایک دوسری ہیر و ہنز کا نام لیتے ہوئے کہا۔ مومن اب بے زار ہونے لگا تھا۔ وہ صبح سویرے تصویروں کی سائزنگ میں سرکھپانا نہیں چاہتا تھا۔

”شبلی اس وقت میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور تمہاری آدھی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔“ اُس نے بے حد صاف گوئی سے کہا اور شبلی نے بغیر برا منائے فوراً ہی اپنی ٹون بدلی۔

”جان مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئی، سوسوری جان۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”نہیں..... نہیں ابھی تو میں آڈیشنز کے لیے نکل رہا ہوں۔“ مومن نے فوراً کہا۔ شیلی نے جواباً کچھ خفگی سے اُس سے کہا۔

”You have been so mean to me.“ اتنی بڑی ہٹ دی ہے تمہیں اور تم پھر بھی اگلی فلم کے لیے آڈیشن کرنے بیٹھے ہو۔“

مومن نے بے ساختہ کہا۔
 ”تمہیں پتا ہے میں ہیروئن repeat نہیں کرتا۔ یہ میری کامیابی کی وجہ ہے۔“
 ”گالی دینا چاہتی ہوں تمہیں میں اس بات پر۔“ شیلی نے جواباً کہا۔

”وہ تم text کر دینا۔ ابھی تو میں نکل رہا ہوں گھر سے۔“ مومن نے جواباً tease کرنے والے انداز میں اُسے کہا۔ ”ہو تم ویسے گالیوں ہی کے قابل۔“ دوسری طرف سے شیلی نے فون بند کرنے کے بعد کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُس چھوٹے سے کمرے میں پڑا فرنیچر مرمت طلب ہونے کے باوجود اپنے ”خاندانی“ ہونے کا اظہار کر رہا تھا اور اُس گھر، کمرے اور اُس گھر میں رہنے والوں کی خستہ حالی کے باوجود اُس کمرے میں فرنیچر کی بہت ساری چیزیں تھیں جو مرمت ہو جائیں تو اینٹک کہلاتیں۔ اور فرنیچر کی انہیں آئٹمز میں وہ قد آدم شیشہ بھی تھا جو پہلے کبھی کسی ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ منسلک تھا، مگر اب اُس کے بغیر ہی اُس دیوار پر لگایا گیا تھا جس کے سامنے اس وقت مومنہ سلطان کھڑی انگلیوں میں سگریٹ لیے کش لگاتی اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے جیسے آئینے سے باتیں کر رہی تھی۔

”آئینہ مجھ سے محبت کرتا ہے، میں تم سے اور تم کسی اور سے..... تینوں پاگل ہیں اور تینوں خالی ہاتھ رہیں گے۔“ وہ آخری جملے پر ہذیبانی انداز میں قہقہہ مار کر ہنسی پھر کھانسی۔ اُس کی آنکھوں میں پانی آگیا اور وہ سُرخ ہو رہی تھیں۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔
 ”دیکھو اس سگریٹ کو تمہارے ہونٹوں نے چھوا ہے۔ اب تک جل رہا ہے۔ ایسی ہی ایک آگ میں، میں بھی جل رہی ہوں۔“

وہ جیسے آئینے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہی تھی۔

”اسے تو میں بجھا سکتی ہوں، مگر میں اور یہ آئینہ ہم جل سکتے ہیں، بجھ نہیں سکتے۔ آگ ہو سکتے

اُس نے جلتے ہوئے سگریٹ کو اپنی ہتھیلی پر بچھایا اور آئینے میں نظر آنے والے اُس عکس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ بجھا ہوا سگریٹ ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے اُس نے فون اٹھا لیا اسکرین پر داؤد کا نام چمک رہا تھا۔

”مومنہ ساڑھے بارہ بجے ہے آڈیشن..... تم آرہی ہونا۔ دیکھو دیر مت کرنا۔“ دوسری طرف

وہ داؤد تھا۔

”ہاں..... ہاں..... میں آرہی ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں نکل رہی ہوں۔“ داؤد نے اُس کی بات سننے سے پہلے ہی فون بند کر دیا۔ وہ جلدی میں تھا اور ہمیشہ ہی جلدی میں رہتا تھا۔

”مومنہ ناشتا تو کر لو بیٹھ کر۔“ وہ ابھی فون اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی جب ثریا ایک ٹرے میں چائے کا کپ اور دو سلاؤس رکھے آئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر ناشتا کرنے بیٹھ گئی۔ ثریا چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر اُس نے کہا۔

”ریہرسل کر لی نا؟“

”ہاں۔“ چائے کا سپ لیتے ہوئے مومنہ نے کہا۔

”مجھے سنا دو ایک بار۔“ ثریا کو تجسس ہوا۔

”نہیں اماں..... بس اب آڈیشن میں ہی بولوں گی یہ لائنز۔“ اُس نے سلاؤس کا ایک اور لقمہ چبا کر چائے سے نگلتے ہوئے کہا۔

”تمہارے کپڑے پر پریس کرتی ہوں۔“ ثریا دروازے کی طرف لپکی جب مومنہ کی آواز نے اُس کے پیروں میں بیڑی ڈالی۔

”میں یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔“ ثریا نے پلٹ کر مومنہ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کی بے چارگی کو دیکھا پھر مدھم آواز میں کہا۔

”کیوں کہتی ہو ہر بار یہ جملہ مومنہ جب جانتی ہو کہ یہ کام چھوڑ بھی نہیں سکتی۔“

”اپنے آپ کو یاد دہانی کرواتی ہوں اور تو کچھ نہیں۔“ وہ کہتے سلاؤس کا آخری ٹکڑا نگلی یوں جیسے

جلدی میں ہو۔

”جہانگیر سے مل لوں پھر ابا سے میک اپ کروانا ہے۔“ اُس نے کہا اور دروازے میں کھڑی

ثریا کے پاس سے گزر گئی جو اُس کے کپڑے لیے وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اپنی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئی جہاں جہانگیر اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے قدموں کی چاپ پر اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اُسے دیکھ کر مسکرایا وہ بھی جواباً مسکرائی۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ وہ اُس کے سوال پر بے اختیار ہنسا اور بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ پھر وہی سوال..... میں ٹھیک ہوں۔“

”مجھے پتا ہے اور ایک دن تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ جہانگیر نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”مجھے یہ بھی پتا ہے۔“

”آڈیشن کے لیے جارہی ہوں..... تم دعا کرنا۔“ اُس نے جہانگیر سے کہا۔

”قلبِ مومن کی فلم کے لیے آڈیشن کے لیے جارہی ہیں نا؟“ جہانگیر نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اُس کا ذہن کہیں گم تھا۔

”میں نے رات کو نیوز میں دیکھا تھا اُس کی فلم کو پھر ایوارڈ ملا ہے۔“ جہانگیر بڑی ایکساٹمنٹ سے اُسے بتانے لگا۔

”آپ کو پتا ہے ہیٹ ٹرک کر لی ہے اُس نے بیسٹ فلم اور ڈائریکٹری۔ تین فلمز بنائی ہیں اور

تینوں نے ایوارڈ جیتے ہیں۔ انڈسٹری کا پہلا ڈائریکٹر ہے جس نے یہ کارنامہ کیا ہے۔“ جہانگیر کے بغیر

اُسے بتاتا چلا گیا اور وہ صرف اُس کا چہرہ دیکھی چلی گئی۔ وہ آج بھی انڈسٹری کی اس طرح خبر رکھتا تھا جیسے

انڈسٹری کا حصہ ہو۔ اس بیماری میں گھر میں قید ہو جانے کے بعد اُس کی واحد activity یہی رہ گئی

ہے..... TV پر شو بزم کی خبریں اور فلمز دیکھنا۔ وہ کبھی کبھار اُس کے لیے نیوز اسٹالنز سے پرانے شو بزم میگزینز

لے آتی تو جہانگیر کی خوشی دیدنی ہوتی۔

”دعا کرنا جہانگیر۔“ اُس نے جہانگیر سے کہا۔ یہ جیسے اُس کا معمول تھا۔ کسی بھی آڈیشن یا

پروجیکٹ کی شوٹ شروع ہونے سے پہلے جہانگیر سے دعا کے لیے کہنا۔ اُسے پتا نہیں کیوں اُس کی دعا پر

یقین تھا۔ شاید اُس صبر اور برداشت کی وجہ سے جس سے وہ اپنی بیماری کاٹ رہا تھا۔

”فکر نہ کریں..... مل جائے گی آپ کو فلم..... سٹار بنیں گی آپ..... بہت بڑی فلم سٹار۔“ وہ

جیسے اُس کو please کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہن کی جدوجہد سے وہ واقف تھا۔ شو بزم کے لئے اُس کی

نا پسندیدگی سے بھی..... لیکن اپنے لیے دی جانے والی اُس کی قربانی سے بھی۔

”ستارہ نہیں بننا مجھے..... ستارے تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ مجھے تو صرف تمہارا علاج کروا کر

تمہارے ٹوٹے ستارے کو بچانا ہے۔“

اُس کا چہرہ دیکھے ہوئے مومنہ نے سوچا تھا۔

”میں باہر تک چھوڑنے آؤں۔“ جہانگیر نے اُسے آفر کی۔

”بالکل نہیں میں ابھی ابا کے پاس جا رہی ہوں میک اپ کروانے۔ تمہیں بیٹھنا پڑے گا

خواخواہ ہی برآمدے میں..... وہاں گرمی ہے، تم یہیں بیٹھو۔“ اُس نے فوری طور پر اُسے منع کر دیا۔ پھر وہ

اس کی سائیڈ ٹیبل پر جا کر اُس کی میڈیسنز چیک کرتے ہوئے بولی۔

”کون کون سی میڈیسنز ختم ہو گئی ہیں؟ میں آج لیتی آؤں گی۔“ جہانگیر نے اُسے دو میڈیسنز کا

بتایا تھا اُسے ان کی پونینسی پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ کیوں کہ اُسے گھر میں ہر فرد کی میڈیسن کی

پونینسی کا پتا تھا۔ باہر سے سلطان کی آواز آنے لگی۔ وہ اُسے بلارہا تھا۔ وہ جہانگیر کے کمرے سے واپس

اپنے کمرے میں گئی اور استری کیے کپڑے پہن کر برآمدے میں اُس کرسی پر آ کر بیٹھ گئی جس پر بٹھا کر

سلطان کسی کا بھی میک اپ کیا کرتا تھا۔

وہ پرانے زمانے کا ایک وینٹی باکس کھولے اُس میں موجود چیزوں کو ادھر ادھر کرتے مومنہ کے

انتظار میں تھا۔ مومنہ کے کرسی پر بیٹھتے ہی اُس نے بے حد پرویشنل انداز میں ایک کپڑا مومنہ کی گردن میں

جھانک لیا۔ وینٹی باکس میں سے ایک فاؤنڈیشن نکال کر بڑی پھرتی سے اُس فاؤنڈیشن کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر

گیلے sponge کے ساتھ اُسے مومنہ کے چہرے پر لگانے لگا۔ نقطوں کی شکل میں..... وہ میک اپ

کرنے کا پرانا طریقہ تھا اور سلطان پرانے طریقوں سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک

لگائے مومنہ خاموشی سے میک اپ کرواتے ہوئے وینٹی باکس کے ڈھکن پر لگی حسن جہاں کی ایک بے حد

دلکش مسکراہٹ والی تصویر کو دیکھنے لگی۔ جس پر کوئی بھی نظر ڈالتا تو اُسے ایسا ہی لگتا جیسے وہ اُسے ہی دیکھ کر

مسکرا رہی تھی۔

وہ اب بھی اُسے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس پر نظریں جمائے مومنہ دل ہی دل میں گھڑی کی

سوئیاں گن رہی تھی۔

”ابا ذرا جلدی مجھے بس پکڑنی ہے۔“ مومنہ نے بالا آخر سلطان سے کہہ ہی دیا۔ سلطان کے

ہاتھ پہلے سے زیادہ تیزی سے کام کرنے لگے تھے اور وہ ساتھ کہنے لگا۔

”ہاں..... ہاں..... بس ہو جائے گا پانچ منٹ میں سب۔ حسن جہاں کو بھی پانچ منٹ میں تیار

کرتا تھا میں۔ اُسے بھی جلدی ہوتی تھی ہر کام کی۔ ایسی مکھن جیسی دودھیا ملائم سکن تھی اُس کی۔ پاؤں بھی پھسلتا تھا۔ میرے علاوہ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی وہ چہرے کو۔ میرے ہاتھ کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں تھا اُسے۔ مومنہ حسن جہاں کا تذکرہ سننے کی عادی تھی اور صرف وہ ہی نہیں اُس گھر کا ہر شخص اور سلطان کا ہر دوست اور ملنے والا۔

وہ حسن جہاں کا میک اپ آرٹسٹ رہ چکا تھا اور دن میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا جب اُسے کسی نہ کسی حوالے سے حسن جہاں کی یاد نہ آتی تھی۔

وینٹی باکس کے ڈھکن پر لگی اُس کی مسکراتی تصویر دیکھتے ہوئے مومنہ اُس کے قصے باپ کی زبان سے سن رہی تھی اور وہ سب اتنی بار سننا ہوا تھا کہ وہ باپ کا اگلا جملہ بھی دہرا سکتی تھی۔

”یہ لو..... ہو گیا کام۔ اب بس لپ اسٹک رہ گئی۔“ سلطان گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھا ہوا اور اُس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”ابالپ اسٹک میں خود لگاتی ہوں۔“ مومنہ نے باپ کو روکنے کی کوشش کی۔ سلطان نے اُسے ٹوک دیا اور وینٹی باکس میں سے اُس کے لیے لپ اسٹک ڈھونڈنے لگا۔

”لپ اسٹک لگانا ہی تو اصل آرٹ ہے۔ کیمرے کے سامنے بھدی اور اناڑی کی لگی ہوئی لپ اسٹک کی وجہ سے بڑے بڑے خوب صورت چہرے بھی برے لگتے ہیں۔“ وہ اس کے ہونٹوں پر برش سے لپ اسٹک لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ اپنا پاؤں ہلانے لگی تھی اُسے واقعی جلدی تھی۔

”یہ لو..... دیکھو ٹھیک ہے نا۔“ سلطان نے بالآخر اُس سے کہا۔ اُس نے آئینے میں خود پر نظر ڈالتے ہوئے فوری طور پر اٹھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک ہے ابا۔“ سلطان پرانے زمانے کا میک اپ آرٹسٹ تھا، لیکن مومنہ کو اُس کے ہاتھ پر یقین تھا۔ وہ جب بھی سلطان سے میک اپ کروا کر جاتی تھی..... اسکرین پر اُس کا چہرہ بے حد اچھا لگتا تھا۔ سلطان اپنے کام کا ماہر تھا۔ اپنے زمانے میں فلم انڈسٹری میں اُس کا طوطی بولتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”وہ کل جہانگیر کا ڈائلاکس ہے۔ تمہارے سیریل کی payment کب آئے گی۔“ ثریا ایک دم رکرے سے برآمدے میں آئی اور مومنہ کو یاد دہانی کروائی۔

”آج جاؤں گی آڈیشن کے بعد payment کے چیک کے لیے۔ جو نیئر آرٹسٹ ہوں، خود کہاں آئے گی میری payment۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

”بس آپ لوگ دعا کریں۔ یہ فلم مل جائے کسی طرح۔“ اُس نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے ثریا اور سلطان دونوں سے کہا۔

”میں نے تیار کیا ہے۔ تم دیکھنا کیمرے کے سامنے حسن جہاں لگے گی۔ یوں رول دیں گے یوں۔“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اُس نے عقب میں سلطان کو بے حد گمان سے ثریا سے کہتے سنا۔ وہ باپ سے یہ نہیں کہہ سکی کہ اب کوئی بھی حسن جہاں کو نہیں جانتا پہچانتا ہے..... اور میک اپ دیکھ کر اگر رول دیے جاتے تو.....

اسٹاپ پر کھڑی بس پر بیٹھتے ہوئے بھی اُس نے یہی سوچا تھا۔
 ”ابا کو لگتا ہے ان کا وینٹی باکس مجھے حسن جہاں بنا دے گا۔ ابا کو پتا ہی نہیں ان کے وینٹی باکس کی ساری چیزیں expire ہو چکی ہیں یا د نمبر ہیں۔ اب وہ برانڈ بھی بند ہو چکا ہے جو برانڈ حسن جہاں کا پسندیدہ تھا۔“ اس نے کھڑکی سے باہر سڑک پر بھاگتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے تلخی سے سوچا تھا۔ یہ ساری باتیں وہ صرف سوچ سکتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی۔

”ابا ہر بار مجھے حسن جہاں بنا کر دنیا میں بھیجتے ہیں اور میں پھر مومنہ سلطان بن کر رہ جاتی ہوں۔ اُس نے سوچا۔



آفس کی reception میں تقریباً 25 لڑکیاں تھیں۔ مومنہ اُن میں سے چند چہروں کو فوراً پہچان گئی۔ وہ چند اُبھرتی ہوئی ماڈلز تھیں اور چند دوسری ایکٹریسز جنہوں نے حال ہی میں ایک آدھ سیریل میں مین لیڈ کی تھی اور وہ اُس Reception area میں بیٹھی کچھ نہ کہے اور کیے ہوئے بھی بے حد گلیمرس اور اسٹائلش لگ رہی تھیں۔ اُن میں سے کچھ اپنے اپنے سیل فون پر مصروف آس پاس بیٹھی لڑکیوں کو انگوڑ کر رہی تھیں۔ کچھ جو ایک دوسرے سے واقف تھیں وہ بیٹھی اور کھڑی گپ شپ لگا رہی تھیں۔ چند ایک ہاتھ میں پکڑے اسکرپٹ پر نظر ڈال رہی تھیں اور چند ایک دوسری لڑکیوں کو گھورنے اور evaluate کرنے میں مصروف تھیں اور وہ سب ہر طرح کے کپڑوں میں ملبوس تھیں سادہ جینز اور کرتوں سے لے کر فارمل پینٹس اور tunics تک اور کچھ اسکرٹس بھی۔ لانگ شارٹ دونوں قسم کے..... صرف چند ایک تھیں جو شلواری قمیص میں ملبوس تھیں اور مومنہ ان میں واحد تھی جس کے گلے میں دوپٹا بھی لٹک رہا تھا۔ باقی کوئی اگر شلواری قمیص میں ملبوس تھی بھی تو سیلیولیس قمیص میں ٹخنوں سے بہت اونچے اور گھٹنوں سے تھوڑا ہی نیچے والی کیپری میں۔

مومنہ کے لیے وہ مجمع نیا نہیں تھا۔ نہ وہ وہاں discomfort کا شکار ہوئی تھی نہ کم اعتمادی کا۔

وہ ایسے ہی crowd کے ساتھ میڈیا میں کام کر رہی تھی اور اُن سب کی insecurities اور رویوں سے بخوبی واقف تھی، مگر وہاں بیٹھے اُسے یہ یقین نہیں تھا کہ اس crowd میں وہ اپنی جگہ بنائے گی یا نہیں، لیکن اس وقت اس آڈیشن کے لیے وہاں بیٹھے ہوئے اس کے سر پر جہانگیر کا کل کا ڈائلا سس سوار تھا۔ اُس کی وہ میڈیکل فائل جو گھر سے نکلتے ہوئے ثریا نے اُس کے ہاتھ میں تھمائی تھی کیوں کہ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں تبدیل کی تھیں اپنے پچھلے چیک اپ میں..... جس میں مومنہ شوٹنگ کی وجہ سے نہیں جاسکی تھی اور وہ نئی دوائیاں مہنگی اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے سلطان کو اس وقت خرید کر شروع نہیں کروا سکی تھی۔ جہانگیر کے میڈیکل اخراجات اسی طرح اوپر نیچے جاتے تھے اور اُس کے اچانک آنے والے اخراجات مومنہ کے سارے مالیاتی تخمینوں اور اندازوں کو ملیا میٹ کر دیتے تھے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر مہینے کسی نہ کسی سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتی۔

وہ اُس وقت بھی اُس میڈیکل فائل کو کھولے اُن اخراجات کا حساب لگانے میں مصروف تھی جو اُس کا رائلٹی چیک نہ ملنے پر اُسے پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ فائل کو اس طرح کھولے اُس میں سرگھسائے بیٹھی تھی کہ دائیں بائیں بیٹھی لڑکیاں اُس فائل کے اندر موجود Prescription کو نہ دیکھ سکیں، مگر جس وقت وہ بالآخر اُس سارے مینٹل maths سے گہرا سانس لیتے ہوئے فارغ ہوئی اور فائل بند کرتے ہوئے اپنا سر سیدھا کیا، تو اُس کے برابر بیٹھی لڑکی نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”You are so focussed“ جب سے آئی ہیں بس اسکرپٹ میں سر دیے بیٹھی ہیں۔ مجھے تو ابھی تک لائنز بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔“ اُس لڑکی نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ وہ بھی جواباً اُسی انداز میں مسکرا دی اور اُسے اچانک آڈیشن اور اسکرپٹ دوبارہ یاد آیا۔ وہ لڑکی پہلی بار کسی ایکٹنگ اسائنمنٹ کے لیے آڈیشن دینے آئی تھی اور نروس تھی۔ چند لمحے وہ مومنہ سے گپ شپ کرتی رہی اور جب وہ خاموش ہو کر اپنے اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہوئی تو مومنہ Reception area سے باہر نکل آئی۔ اُس کی باری میں ابھی دیر تھی اور اُسے بہت ضروری کال کرنی تھی۔

اسٹوڈیو کی اینٹرنس کے سامنے ہی ٹہلتے ہوئے اُس نے اپنے ایک ڈائریکٹر کو فون کیا۔
 ”مومنہ ابھی تمہیں ہی فون کرنے والا تھا میں۔ ایک رول ہے۔ کام نکالا ہے خاص طور پر

تمہارے لیے میں نے سوپ میں۔“ سلیم بھائی نے چھوٹے ہی اس کی آواز سنتے ہوئے کہا۔ مومنہ بے اختیار خوش ہوئی۔

”بڑی مہربانی سلیم بھائی..... کتنے دن کا کام ہے؟“
 ”دس دن کا۔“ اُن کے اگلے جملے نے اُسے مایوس کیا تھا۔
 ”کوئی بڑا رول دیتے مجھے سلیم بھائی اس بار تو.....“

”ہاں..... ہاں اگلی بار بڑا رول دوں گا..... کتنی بار تو سمجھایا ہے تمہیں کہ پروڈیوسر کے ساتھ گپ شپ لگایا کرو۔ اس کی پارٹی میں جاؤ، دوستی بناؤ۔ آنا جانا ہوگا تو رول بھی ملے گا اور رول بڑا بھی ہوتا جائے گا۔“ سلیم بھائی نے اُسے فوری طور پر وہی مشورہ دیا تھا جو وہ ہمیشہ دیتے تھے۔ وہ مومنہ کے فن کے واقعی قدردان تھے، مگر کام وہ اُسے زیادہ نہیں دے پاتے تھے اور نہ دینے کی وجوہات وہ ہمیشہ مومنہ کو بڑی صاف گوئی سے بتا دیتے تھے جنہیں وہ برامانے بغیر سن لیا کرتی تھی کیوں کہ وہ وجوہات وہ پہلے ہی جانتی تھی۔
 ”میرا چیک مل جائے گا سلیم بھائی آج۔“ اُس نے سلیم بھائی کے مشوروں کے جواب میں عجلت کے عالم میں کہا۔

”آج تو مشکل ہے۔“ انہوں نے جواباً کہا۔

”کسی طرح کروادیں سلیم بھائی..... جہانگیر کا ڈائلاکس ہے کل۔ تھوڑی بہت رقم تو دلوا دیں مجھے۔“

اُس نے کچھ منت بھرے انداز میں کہا۔ وہ اُن کا انکار سن کر واقعی پریشان ہو گئی تھی۔
 ”اچھا..... اچھا میں کرتا ہوں کچھ..... تم آرہی ہو؟“ سلیم بھائی کو جہانگیر کی بیماری کا پتا تھا اور وہ اُس سے ہمدردی رکھتے تھے۔

”ہاں دو تین گھنٹے تک۔“ اس سے پہلے کہ وہ ان سے کچھ اور کہتی اُس نے اپنے عقب میں داؤد کی آواز سنی۔ وہ خفا لگ رہا تھا۔

”حد ہے مومنہ میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ فون الگ سے بزی چل رہا ہے تمہارا۔“ داؤد اندر سے باہر نکلا تھا۔ وہ مومنہ کا اسٹنٹ تھا۔

”جی ٹھیک ہے سلیم بھائی، خدا حافظ۔“ مومنہ نے فون بند کرتے ہی اُس سے معذرت کرنا شروع کی۔

”ایک ضروری کال تھی بس..... ختم ہو گئی میری باری آگئی کیا؟“

”یہ خاص طور پر لی ہے تمہاری باری..... اور تم غائب اب آ جاؤ جلدی۔ ڈائلاگز یاد ہیں نا۔“ وہ کہتے ہوئے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا اور وہ بھی تیز قدموں سے اُس کے پیچھے چل دی۔

☆.....☆.....☆

داؤد نے اُس کے لیے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ پہلی نظر میں اندر داخل ہونے پر اُسے قلبِ مومن نظر نہیں آیا جو اس وقت ایک ٹیبل پر لیپ ٹاپ پر وہ فوٹیج دیکھ رہا تھا جو آڈیشن کے لیے شوٹ ہو رہی تھی۔

”وہاں چلی جائیں۔“ داؤد نے اُسے اسٹوڈیو کے اُس حصہ کی طرف ڈائریکٹ کیا جہاں سپاٹ لائٹس تھیں اور مومنہ نے اُس وقت ایک ٹیبل پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھے مومن کو دیکھ لیا تھا، مگر وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ اُس کی پوری توجہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھی۔ اُس اسٹوڈیو میں crew کے چند لوگ بھی تھے۔ مانیٹر پر بیٹھا ایک شخص اور کیمرے کے پیچھے کھڑا ایک اور شخص۔

مومنہ رُکے بغیر سیدھا اُس جگہ پر جا کھڑی ہوئی جہاں ایک اسٹول پڑا تھا اور سپاٹ لائٹ کی روشنی مرکوز تھی اور جیسے ہی وہ وہاں کھڑی ہوئی قلبِ مومن نے پہلی بار نظر اٹھا کر اُسے دیکھا اور لیپ ٹاپ کے بجائے اُس مانیٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا جو اُس ٹیبل پر ہی پڑا تھا۔

”یہ مومنہ سلطان ہیں۔“ داؤد نے قلبِ مومن کو جیسے اُس کا تعارف دیا وہ مومن کی میز پر جا کر بیٹھ چکا تھا۔

”ان کی شوریل میں نے share کی تھی آپ کے ساتھ۔“ اس نے مومن کو یاد دلایا۔ سپاٹ لائٹس کی روشنی میں بہت دور نیم تاریکی میں میز کے دوسری طرف بیٹھے قلبِ مومن کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اُس وقت وہاں تیز روشنیوں میں کھڑی داؤد کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

”اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔“ وہ پہلا جملہ تھا جس میں قلبِ مومن نے اُسے براہ راست مخاطب کیا تھا۔

”میں مومنہ سلطان ہوں، گریجویٹیشن کیا ہے۔ تین چار سال سے ایکٹنگ کر رہی ہوں۔“ مومنہ نے میکا نیکی انداز میں کہنا شروع کیا۔

”میں نے کبھی کسی فلم میں نہیں دیکھا آپ کو۔“ مومن نے اُسے ٹوکے ہوئے کہا۔

”TV پر کام کرتی ہوں میں۔“ مومنہ کو اب اُسے دیکھنا کچھ آسان لگنے لگا تھا۔

”کس سیریل میں lead کیا ہے؟“ مومن کا اگلا سوال آیا۔

”لیڈ نہیں کیا..... کافی سوپس میں کام کیا ہے..... سیریل میں اب کر رہی ہوں۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔ اُس نے قلبِ مومن کو داؤد کی طرف مڑتے اور بے حد تند و تیز لہجے میں کہتے سنا۔

"She works in soaps and you have invited her for my

movie!"

مومنہ کا رنگ سرخ ہوا، مگر وہ اُس سے نہیں داؤد سے مخاطب تھا اور داؤد نے کچھ کمزور سے لہجے میں اُسے defend کرنے کی کوشش کی۔

”ایکٹریس بہت اچھی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا..... آپ دیکھ لیں۔“ مومن داؤد کے جملے پر دوبارہ سیدھا ہو کر مومنہ سے مخاطب ہوا۔

”اسکرپٹ آپ کے پاس ہے؟“ اس نے کہا۔

”جی۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔

”پہلا سین پر فارم کر کے دکھائیں۔“ اگلی ہدایت آئی۔ مومنہ نے کسی توقف کے بغیر ہاتھ میں پکڑے اسکرپٹ کو میڈیکل فائل کے اوپر رکھتے ہوئے کھولا۔ ایک نظر صفحے پر ڈالی پھر اسکرپٹ اور میڈیکل فائل کو اُس اسٹینڈنگ اسٹول پر رکھنے کے بعد وہ آڈیشن کے لیے تیار ہو گئی۔

سامنے کیمرے میں دیکھتے ہوئے اُس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

”میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو..... محبت سے زیادہ گہرا، پرانا اور دائمی رشتہ ہے میرا اور تمہارا۔ کوئی مجھے چوائس بھی دے، تو میں اپنا اور تمہارا رشتہ نہ بدلوں۔“ پہلا ڈائلاگ بولتے ہوئے اُس نے اپنے دوپٹے کو دوبارہ ٹھیک کیا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسرا ڈائلاگ بولتی۔ اُس نے قلبِ مومن کو کہتے سنا۔

”دوپٹا اتار دیں اپنا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اُس نے کہا۔

”جی؟“

”سین خراب کر رہا ہے یہ۔“ قلبِ مومن نے جواباً مانیٹر پر ہی اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ فوٹو

چینک تھی وہ یہ دیکھ چکا تھا۔

”میں باندھ لیتی ہوں۔“ اس نے مومنہ کو جواباً کہتے سنا اور اس نے کچھ خفگی کے عالم میں مانیٹر

سے نظریں ہٹا کر سیدھا اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اُتار دینے میں کیا اعتراض ہے آپ کو؟“

”میں comfortable نہیں ہوں گی سین میں۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔ قلب مومن

بے اختیار ہنسا۔

”میری فلم میں کوئی دوپٹا نہیں لیتا اور آپ دوپٹا اتار دینے سے سین نہیں کروا پائیں گی؟ تم نے

رول بتایا ہے اسے۔“ اُس نے پہلا جملہ مومنہ سے اور آخری داؤد سے بولا تھا۔

”آہ وہ میری اتنی detail میں بات نہیں ہوئی بس آڈیشن والے سینز دیے تھے۔ بریف بھی تھا

اُس میں۔“ داؤد نے اتنے ڈائریکٹ کال پر کچھ گڑبڑا کر کہا تھا۔ داؤد کی بجائے مومنہ نے اُس کے سوال

کا جواب دیا تھا۔

”ہیروئن کی بیسٹ فرینڈ کا رول ہے جو اپنی دوست کے منگیترو کو چھیننا چاہتی ہے۔“ قلب

مومن نے اس کی آواز پر گردن موڑ کر سیدھا دیکھا اور پھر بے حد تیکھی آواز اور لہجے میں کہا۔

”ویمپ کا رول ہے جو ایک مرد کو پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ پارٹیز میں جاتی ہے۔

ناچتی گاتی ہے، بوائے فرینڈز کے ساتھ پھرتی ہے۔ آئٹم نمبرز بھی کرتی ہے، تو کیا دوپٹا اُتارے بغیر یہ

سب تم کر سکو گی؟“ وہ سیدھا آپ سے تم پر آگیا اور اُس کے انداز میں تنفر تھا اور انداز چیلنج کرنے والا۔

مومنہ اور وہ چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ پھر مومنہ نے بڑی

خاموشی سے اپنا دوپٹا اُتار کر اُسی اسٹول پر رکھ دیا جہاں اُس نے وہ اسکرپٹ اور میڈیکل فائل رکھی تھی اور

پھر دوبارہ اُسی جگہ آ کر کھڑی ہو گئی جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔ ایک بار پھر مومن اور وہ ایک دوسرے کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر مومنہ نے اپنا اگلا ڈائلاگ بولنا شروع کر دیا۔

”تم احمدز یاد تم مجھ سے میری عزت کیا چھینو گے۔ عزت میری جوتی کی نوک پر اور ذلت سے

بڑھ کر مجھے کبھی کوئی چیز اس آئی نہیں۔“ قلب مومن کو لحظہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے وہ اس سے ڈائریکٹ

مخاطب تھی۔ اُس کے اگلے ڈائلاگ سے پہلے ہی اُس نے تیزی سے داؤد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”She can act..... لیکن میرا ایشو گلیمر ہے اور مجھے assurance نہیں کہ یہ گلیمرس اور

seductive لگے گی جو اس رول کی ڈیمانڈ ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ carry کر لے گی ابھی تو یہ شلوار قمیص میں ہے اس لیے لگ رہا ہے کہ شاید

گلیمرس نہیں لگے گی۔“ داؤد نے اس سے کہا۔

”Stringy tops, hot pants اور bikini میں بھی مجھے لگتا ہے یہ ایسے ہی لگے گی۔“

قلبِ مومن نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور مومنہ نے اُس کی بات سن لی تھی۔

”میں یہ کپڑے تو نہیں پہن سکتی، لیکن میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ میں بہت اچھی

پرفارمنس.....“ مومن نے اُس کا جملہ بچ میں ہی کاٹ دیا تھا۔

”میڈم میں آرٹ فلم نہیں بنا رہا۔ کمرشل فلم بنا رہا ہوں اور میرے ایکٹرز مجھے یہ نہیں بتاتے کہ

وہ کیا نہیں پہنیں گے اور کیا نہیں..... یہ میں اُنہیں بتاتا ہوں۔“ اُس نے بے حد rude لہجے میں اس بار

اُسے مخاطب کیا تھا۔

"You simply don't have what it takes to be a filmstar."

قلبِ مومن نے اپنی اُسی bluntness کا مظاہرہ کیا تھا جس کے لیے وہ مشہور تھا اور مومنہ

چند لمحوں کے لیے جیسے ہل نہیں سکی تھی۔

"Next artist." وہ اب داؤد سے کہہ رہا تھا۔ یہ جیسے مومنہ کے لیے جانے کا اشارہ تھا۔

سرخ دھواں ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ مومنہ نے اپنا دوپٹا اور بیگ اٹھایا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر

برق رفتاری سے اسٹوڈیو سے نکل آئی۔ باہر Reception میں بیٹھی لڑکیوں نے اُس کے چہرے کے

تاثرات سے جیسے اُسے کھوجنے کی کوشش کی اور اُنہیں زیادہ جدوجہد کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اسٹوڈیو سے باہر سڑک پر چلتے ہوئے بھی اُس کے کانوں میں قلبِ مومن کے جملے گونج رہے

تھے۔

”چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے تھا تمہیں مومنہ سلطان..... یا شاید شرم سے ڈوب مرنے

کے لیے چلو بھر پانی بھی زیادہ ہے۔ تم آخر گئی کیوں تھی اس کے پاس۔“ اُس کے اندر جیسے کوئی بول رہا

تھا۔

”ضرورت نے مجبور کیا تھا۔ ضرورت بڑی بے شرم چیز ہے۔“ اس نے اپنی توجہ بہ پیش کی اور

اس کے اندر کی آواز گونگی ہو گئی یوں جیسے اس نے اس کی توجہ بہ مان لی تھی اور تبھی یک دم مومنہ کو یاد آیا کہ وہ

اسکرپٹ کے ساتھ ساتھ جہانگیر کی میڈیکل فائل بھی اندر اسٹوڈیو میں آڈیشن والی جگہ اسٹول پر ہی چھوڑ

آئی تھی۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ آدھ کلومیٹر چلتے ہوئے وہاں سے دور آگئی تھی اور مین روڈ پر چڑھنے

والی تھی اور اب اُسے پھر واپس پیدل مارچ کرنا تھا۔ وہ بھی قلبِ مومن کے اسٹوڈیو کی طرف

Reception میں موجود لڑکیوں نے اُسے ایک بار پھر وہاں پا کر بڑی حیرانی سے دیکھا۔ مومنہ نے

کھڑے کھڑے داؤد کو فون کیا۔ کسی نے کال ریسیونہ کی۔ ریسیپشن پر receptionist موجود نہیں تھی اور وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک لمحہ جھجکنے کے بعد وہ اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

سپاٹ لائنس والی جگہ پر ایک بے حد ماڈرن خوب صورت اور سٹائلش لڑکی بہت بولڈ کپڑوں میں ملبوس کھڑی تھی اور مومن اُس کے بالمقابل کھڑا اُس کے اسٹپس میں کیے ہوئے لمبے بالوں کو اُس کے ایک کندھے سے دوسرے پر ڈالتے ہوئے کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ وہ لڑکی جواباً مومن سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا اس طرح بال جھٹک کر یہ ڈائلاگ بولوں میں؟“
 ”ہاں۔“ مومن نے جواباً اس سے کہا۔

”میں نروس ہو رہی ہوں آپ کو اتنے قریب اتنے سامنے دیکھ کر I love you۔“ اس لڑکی نے مومن پر لائن مارنے کا یہ موقع بھی ضائع نہیں کیا تھا اور نہ مومن نے فلرٹ کرنے کا۔

"I love you too honey."

اور بالکل اس وقت مومنہ سلطان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی اور وہ کہیں رُکے بغیر سیدھا اُس اسٹول کی طرف آئی جس سے کچھ فاصلے پر مومن اور وہ لڑکی کھڑے تھے۔

”ایکسیکوزمی میری ایک فائل رہ گئی تھی یہاں۔“ مومن اُس کی آواز پر جیسے کرنٹ کھا کر پلٹا۔

”تمہیں کوئی میگزین ہیں..... کس سے پوچھ کر آئی ہو اندر؟“ اس کا پارہ پلک جھپکتے میں آسمان کو

چھونے لگا۔

”سوری میری یہ فائل رہ گئی تھی یہاں بس یہ لینے آئی ہوں۔“ مومنہ تب تک اسٹول کے پاس

پہنچ کر اپنی فائل اٹھا چکی تھی۔

”اپنے آپ کو نوٹس کروانے کے لیے اپنی چیزیں چھوڑ کر جانا بڑا گھٹیا طریقہ ہے۔“ قلب

مومن نے پہلے سے زیادہ بدتمیزی سے کہا اور مومنہ کچھ لمحوں کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔ اُسے غصہ نہیں آتا تھا وہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی تھی، مگر اُس وقت قلب مومن کے اوپر اُسے اتنا غصہ آیا کہ اگر کوئی چیز اُس کے ہاتھ میں ہوتی وہ اُسے دے مارتی۔

”جو کچھ یہاں چل رہا ہے اُس سے تو یہ بہت ہی کم cheap ہے۔“ اُس نے جوابی جملہ اُس

کے منہ پر اُسی کے انداز میں دے مارا تھا۔ مومن کو یقین نہیں آیا اُس نے کیا سنا تھا اور ایسا ہی ری ایکشن اُس لڑکی کا بھی تھا۔

وہ تقریباً چلایا تھا۔

”چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ فائل لینے آئی تھی اور لے کر جا رہی ہوں۔“ وہ کہتے

ہوئے اُس کے پاس سے گزری۔ جب اُس نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

”اگر یہ سب cheap تھا تو تم آئی کیوں تھی یہاں یہ سب کرنے..... اتنی سستی ساوتری ہو تو گھر

بیٹھنا چاہیے تھا تمہیں۔ رول کی بھیک مانگنے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ کہتا گیا اور مومنہ اُس سے بازو

چھڑوانے میں ناکام ہونے پر مزید مشتعل ہو گئی اور اس بار اُس نے مومن کو پوری قوت سے دھکا دیا۔ وہ

لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔

”کام لینے آئی تھی عزت بیچنے نہیں..... مکنی منی، اسکرٹ میں عورت کا جسم دکھا کر تم جو آرٹ کی

خدمت کر رہے ہو اُس کا حصہ نہیں بننا مجھے..... پہلے پتا ہوتا تو شکل بھی نہ دیکھتی تمہاری۔ تمہارا کام

cheap تم اُس سے زیادہ cheap۔“ وہ کہہ کر بجلی کی تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

UA BOOKS